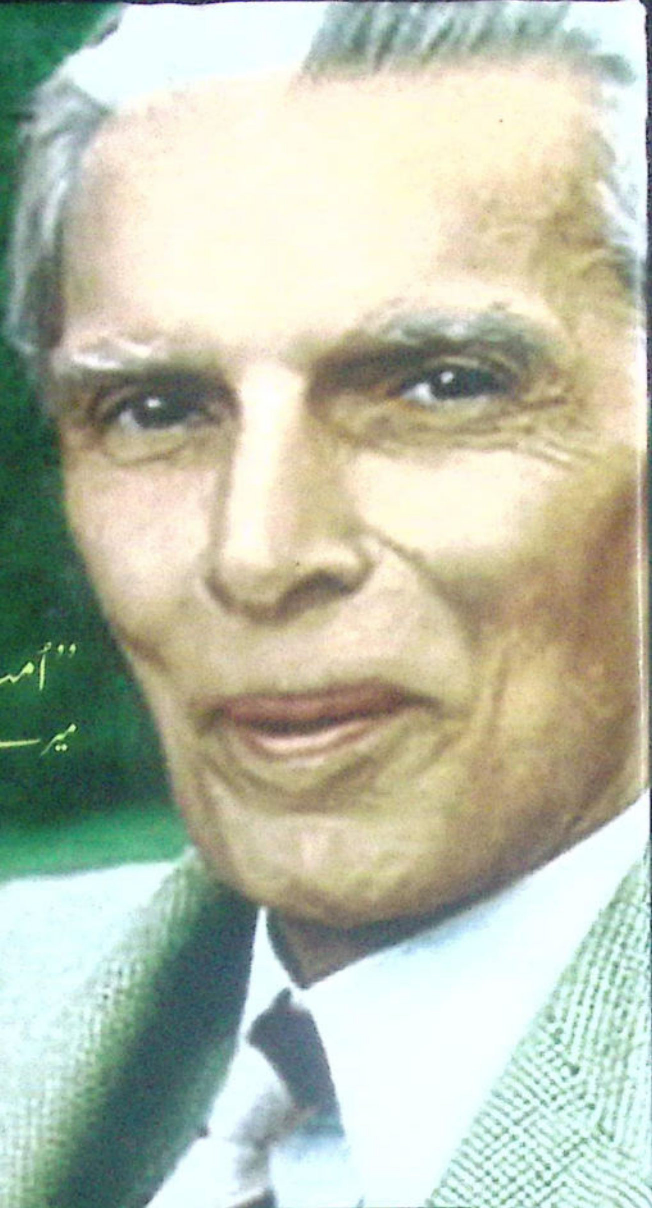


’’اُمید، ہمت اور خود اعتمادی۔
میرے ہم وطنوں کے لیے یہی میرا پیغام ہے‘‘۔
(قائداعظم محمد علی جناح کا قوم سے خطاب، 24 اکتوبر 1947ء)

حیاتِ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

نظرثانی: سیّد اشرف حسین رضوی
تالیف: پروفیسر سعید راشد علیگ



حیاتِ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ

تالیف: پروفیسر سعید راشد علیگ

نظرثانی: سید اشرف حسین رضوی
(ایم اے ہسٹری)

بک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

Hayat e Quaid e Azam
by Prof. Saeed Rashid Alig
- Jhelum: Book Corner Showroom. 2014
224p.
1. Biography - Pakistaniat
ISBN: 978-969-9396-62-5



: فروری 2014ء
: حیاتِ قائدِ اعظم
: پروفیسر سعید راشد علیگ
: سید اشرف حسین قریشی
: امین شاہد، امر شاہد
: [illegible]
: [illegible]
: [illegible]

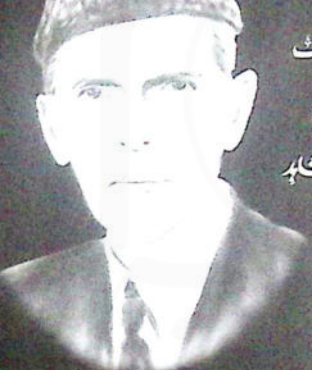
[illegible]

... قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کہیں کوئی ... غلطی نظر آئے تو ادارہ کو ... مطلع فرمائیں تاکہ ...
... میں درستگی عمل میں لائی جا سکے۔ ادارہ "بک کارنر جہلم" کے منتظمین اپنے کرم فرماؤں کے تعاون کیلئے بے حد شکر گزار ہیں۔

Book Corner Showroom
Opposite Iqbal Library, Book Street, Jhelum, Pakistan


بانیٔ پاکستان
قائداعظمؒ
محمد علی جناحؒ

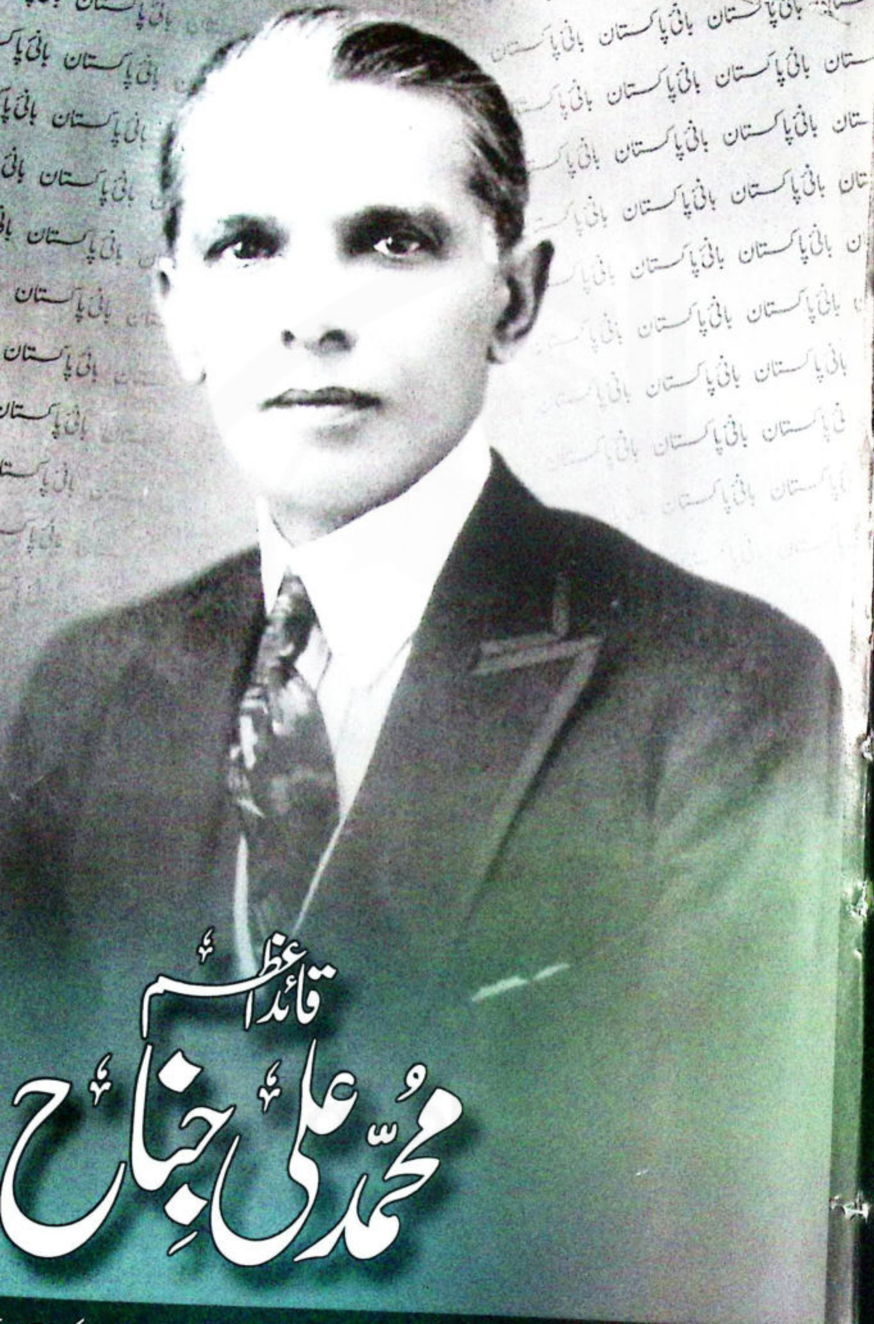
Hayat e Quaid e Azam
by Prof. Saeed Rashid Alig
- Jhelum: Book Corner Showroom. 2014
224p.
1. Biography - Pakistaniat
ISBN: 978-969-9396-62-5



تے : فروری 2014ء
ب : حیاتِ قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ
فے : پروفیسر سعید راشد علیگ
انی : سیّد اشرف حسین رضوی
زایڈیٹنگ : گلن شاہد ۔ امر شاہد
وری : اُبو امامہ
یع : زاہد بشیر پرنٹرز لاہور
شر : بک کارنر جہلم

بک کارنر شوروم، جہلم" کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادار
کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نشانہ بنانا نہیں بلکہ اشاعتی دُنیا میں ایک جدت پ
کرنا ہے۔ اللہ ربُّ العزت کے فضل و کرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کتاب کی تصنیف، پروف ریڈنگ
یڈیٹنگ، طباعت، تصحیح اور جلد بندی میں انتہائی احتیاط کی گئی ہے۔ تاہم غلطی کا احتمال بہرحال باقی رہتا ہے۔ بشر ہونے کے نا
اگر سہواً غلطی رہ گئی ہو یا صفحات درست نہ ہوں تو ناشر، پروف ریڈرز اور طابع ہر قسم کے سہو پر اللہ غفور الرحیم سے عفو و کرم
خواست گار ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب میں اگر کہیں بھی غلطی یا خامی نظر آئے تو ازراہِ کرم مطلع فرمادیں تا کہ آئندہ اید
میں درستگی عمل میں لائی جا سکے۔ ادارہ "بک کارنر جہلم" کے متعلقین اپنے کرم فرماؤں کے تعاون کیلئے بے حد شکر گزار ہیں۔ (نا

Book Corner Showroom
Opposite Iqbal ... Jhelum, Pakistan
Ph: +92 ... 0321 5440882
http://www... ...@gmail.com


قائداعظم
محمد علی جناح

قائداعظم محمد علی جناح کا خاندان



والد محترم
''جناح پونجا''



بھائی
''احمد علی جناح''



زوجہ
''رتی جناح''



بیٹی ''دینا جناح''



ہمشیرہ محترمہ ''فاطمہ جناح'' جواں کی قوت تھیں


BIRTH PLACE
OF
QUAID-I-AZAM MOHAMMED ALI JINNAH
BORN ON 25TH DEC 1876 DIED ON 11TH SEP 1948



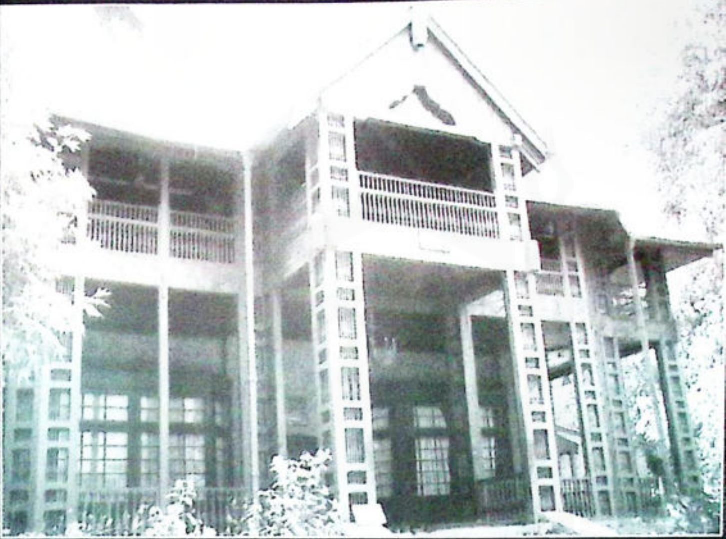
نوروجی، جن کی شخصیت سے قائداعظم بے حد م



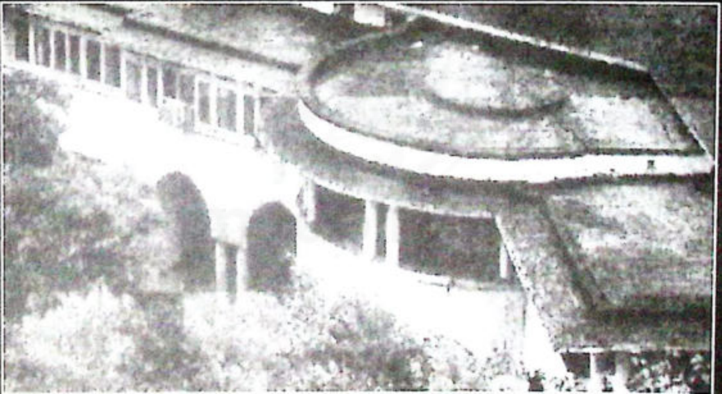


سندھ مدرستہ الاسلام کراچی، جہاں قائداعظم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی





زیارت (بلوچستان) کے مقام پر قائداعظم کی رہائش گاہ،
یہاں بابائے قوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے



قائداعظم لائبریری، لاہور










جناح کے مختلف انداز

ایک عظیم لیڈر کے بیٹھنے کا باوقار انداز



قائداعظم کی ایک جان دار مسکراہٹ



قائداعظم اپنی تصویر پر آٹوگراف دیتے ہوئے



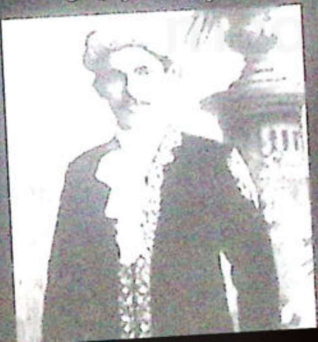
جناح دورانِ مطالعہ

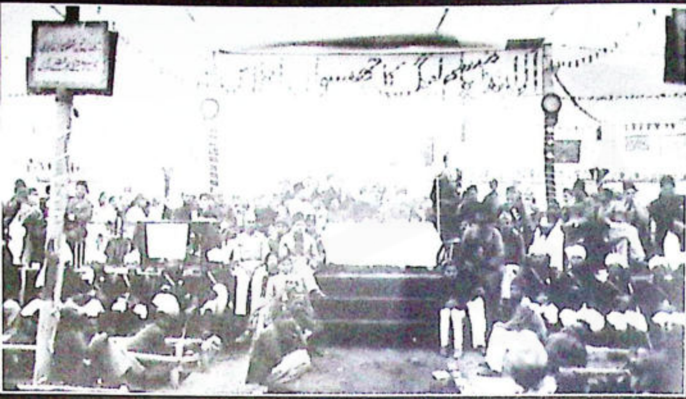


خوشگوار موڈ میں



اپنے خاندانی لباس میں





دسمبر 1938ء مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس (پٹنہ)



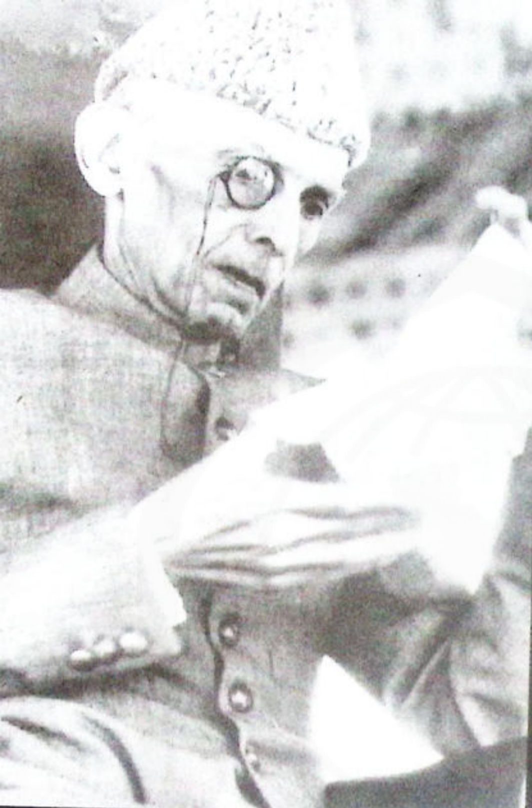
1938ء حیدر آباد دکن، قائداعظم بچوں اور خواتین کے ہمراہ





1940ء قائداعظم مسلم لیگ کے دیگر راہنماؤں کے ساتھ





قائداعظم
محمد علی جناح
کا تقریر
سے قبل
سرسری نگاہ
ڈالنے
کا انداز

مارچ 1940ء کو منٹو پارک لاہور

جلسہ میں شریک عوام کا جم غفیر





1943ء قائداعظم دہلی میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے





1945ء قائداعظم محمد علی جناح ''ٹائم میگزین'' کو انٹرویو دیتے ہوئے



1945ء کوئٹہ ریلوے سٹیشن پر قائداعظم محمد علی جناح کا پُر جوش استقبال



دسمبر 1946ء قائداعظم انڈیا آفس لندن میں لیاقت علی خان کے ہمراہ



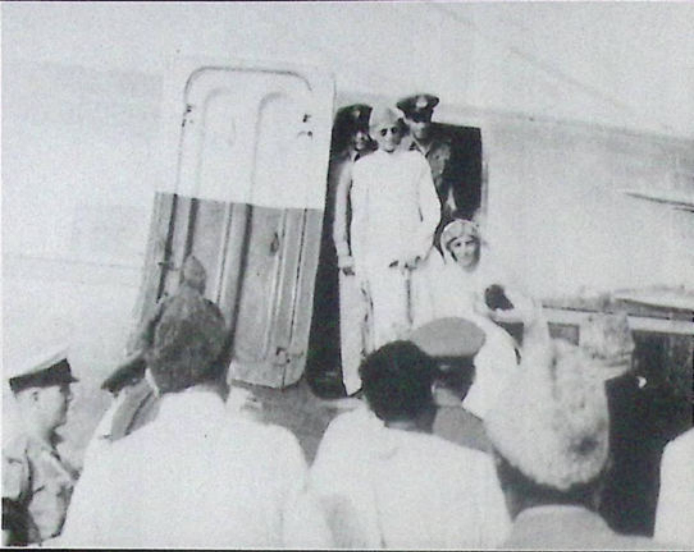


قائداعظم اور جواہر لعل نہرو



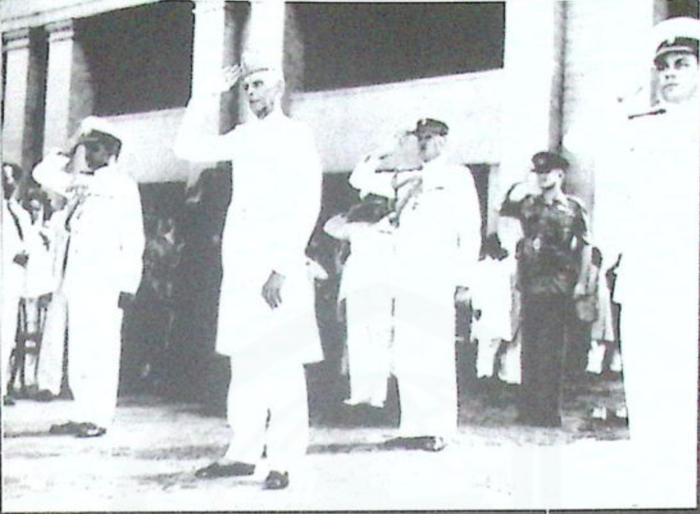


(اعلانِ آزادی)
ریڈیو پر خطاب کرتے ہوئے
پاکستان زندہ باد



7 اگست 1947ء قائداعظم کی پاکستان آمد (کراچی ایئرپورٹ)





14 اگست 1947ء قائداعظم سلامی لیتے ہوئے



14 اگست 1947ء کو قائداعظم کا آئین ساز اسمبلی سے خطاب



15 اگست 1947ء کو قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے حلف اٹھاتے ہوئے





قائداعظم محمد علی جناح قیامِ پاکستان کے بعد پہلی نمازِ عید ادا کرتے ہوئے



قائداعظم محمد علی جناح کا نمازِ عید کے بعد حاضرین سے خطاب



قائداعظم کی صحافیوں سے بات چیت


''مسلمان مصیبت میں گھبرایا نہیں کرتا......''
(قائداعظم کا اکتوبر 1947ء کو لاہور میں جلسۂ عام سے خطاب)



13 اپریل 1948ء: قائداعظم پاکستان ایئرفورس رسالپور کے دورہ میں پریڈ کا معائنہ کرتے ہوئے



جون 1948ء: قائداعظم کی پشاور کے دورہ پر تشریف آوری





قائداعظم سٹیٹ بینک آف پاکستان کا دروازہ کھولتے ہوئے







"بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحلت فرما گئے"
12 ستمبر 1948ء کے "روزنامہ جنگ" اخبار کی نمایاں سرخی


JANG

جنگ کراچی

شیا کے عظیم ترین انسان حضرت قائداعظم کو سپردِ خاک کردیا گیا

قائداعظم نے پاکستان کی بنیاد اخوت و مساوات کے اسلامی اصولوں پر رکھی ہے

13 ستمبر 1948ء کے "روزنامہ جنگ" اخبار کا عکس





قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے موقع پر غم سے نڈھال محترمہ فاطمہ جناح اور دینا جناح



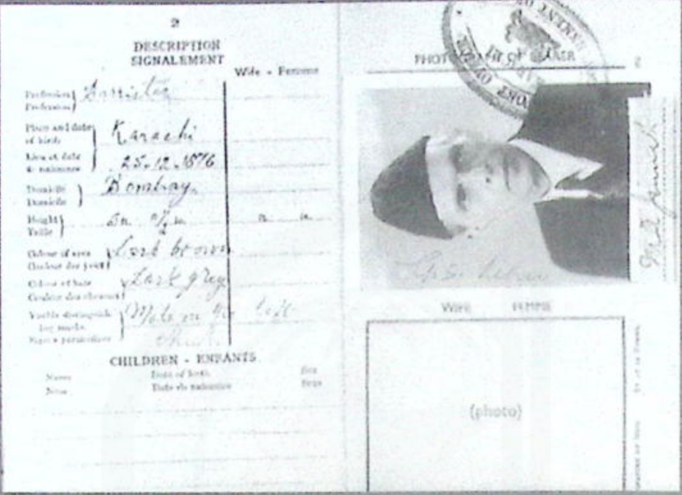


انڈونیشیا کے دارالحکومت جکارتا میں قائداعظم کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کے بعد دُعا کا منظر



قائداعظم کی قبر مبارک کے گرد قرآن خوانی کا ایک منظر





2

DESCRIPTION
SIGNALEMENT

Wife - Femme

Profession / Profession: Barrister

Place and date of birth / Lieu et date de naissance: Karachi 25-12-1876

Domicile / Domicile: Bombay

Height / Taille: [illegible]

Colour of eyes / Couleur des yeux: Dark brown

Colour of hair / Couleur des cheveux: Dark grey

Visible distinguishing marks / Signes particuliers: Mole ...

CHILDREN - ENFANTS

Name / Nom | Date of birth / Date de naissance | Sex / Sexe

PHOTOGRAPH OF BEARER

WIFE FEMME

(photo)

قائداعظم کے ذاتی پاسپورٹ کا عکس







فہرست

حیاتِ قائداعظم

پیش لفظ

مطلوب الحسن سید نے جو قائداعظم کے 1940ء سے 1944ء تک پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ قائداعظم سے ایک فوجی افسر کی ملاقات کا ایک دلچسپ اور فکرانگیز واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک ممتاز مسلم لیگی لیڈر بمبئی میں رہتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی برطانوی فوج میں افسر تھے اور برما میں تعینات تھے۔ وہ چھٹی پر کچھ دنوں کے لئے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ ایک رات دونوں بھائی رات کے کھانے پر قائداعظم کے ہاں آئے بات چیت کے دوران نوجوان فوجی افسر نے قائداعظم سے کہا کہ:

''لوگ کہتے ہیں کہ پاکستان اقتصادی طور پر قابلِ عمل نہیں ہوگا۔''

قائداعظم نے اُن سے پوچھا کہ:

''تم بتاؤ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے؟''

نوجوان فوجی افسر نے فوراً کہا کہ:

''ہمارے نزدیک تو پاکستان یقیناً اقتصادی طور پر قابلِ عمل ہوگا۔''

قائداعظم نے پوچھا:

''کیاتم یہ محض خوش کرنے کے لئے کہہ رہے ہو۔''

فوجی افسر نے کہا:

''ہم تو فوجی افسر ہیں ہمارا کام تو صرف حکم ماننا ہے سوچنا نہیں۔''

اس پر قائداعظم نے فرمایا:

''اگر کبھی میری آرمی ہوئی اور اُس پر میرا کنٹرول ہوا تو میں سب سے پہلے تمہیں فوج سے نکال دوں گا۔ کیوں کہ میری آرمی میں بے دماغ لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔''

قائداعظم کا قول پاکستان کی مسلح افواج کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی سے پہلے تاجِ برطانیہ کے وفادار سپاہیوں اور افسروں کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ صرف دلیر ہوں، وہ صرف حکم مانیں اور دماغ سے نہ سوچیں۔ جنگ کی نوعیت بھی ایسی تھی کہ سوچنا لازمی نہیں تھا۔ آزادی کے بعد آزاد نظریاتی مملکت کی مسلح افواج کے لئے بہادر ہونا، دلیر ہونا، وفادار ہونا بھی ضروری ہے اور روشن دماغ اور روشن ضمیر ہونا بھی، کیوں کہ وہ اس مملکتِ خداداد کی جغرافیائی سرحدوں کے بھی محافظ ہیں اور نظریاتی سرحدوں کے بھی۔ اُنہیں زمین کے ایک ٹکڑے کی حفاظت ہی نہیں کرنی بلکہ زمین کا یہ پاک ٹکڑا جن تصوّرات اور عقائد کی حفاظت اور نشوونما کے لئے بنا ہے اُن کی حفاظت کرنا بھی افواجِ پاکستان کا مقدس فرض ہے۔

سعید راشد

ملٹری کالج، جہلم

حرفِ چند

قائد اعظم محمد علی جناح ایک عظیم قومی راہ نما اور مملکت خداداد پاکستان کے بانی ہیں۔ آپ کی شخصیت اس لحاظ سے منفرد ہے کہ آپ کی قیادت میں قوم نے ایک الگ وطن کے حصول کے لیے پرامن جدوجہد کی۔ اس وقت برصغیر پر انگریز قابض تھے اور مکار ہندو مسلمانوں کے الگ وطن کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی کئی سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر بھی قائد اعظم اور مسلم لیگ کے شدید مخالف تھے۔ ان سب کے باوجود قائد اعظم نے اپنے اصولی موقف، آہنی عزم، مضبوط دلائل اور قوم کے اتحاد کو بروئے کار لاتے ہوئے دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ﴿پاکستان﴾ قائم کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ قائد اعظم کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اصولوں اور ضابطوں کے پابند تھے۔ آپ کے شب و روز میں نظم و ضبط، یقین اور اتحاد کی نشان دہی ہوتی ہے۔ آپ ایک سچے مسلمان تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے سلسلہ میں جب آپ انگلستان تشریف لے گئے تو قانون دان بننے کے لیے تین تعلیمی اداروں کا دورہ کرنے کے بعد ''لنکنز اِن'' کا انتخاب صرف اس لیے کیا کہ اس کے دروازے پر درج دُنیا کے قانون سازوں میں حضور اکرم ﷺ کا نام سرفہرست تھا۔

وطن واپس آنے کے بعد آپ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ زمانہ طالبِ علمی سے ہی آپ دادا بھائی نوروجی اور مسٹر گوکھلے سے متاثر تھے۔ آپ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کے قائل تھے۔ آپ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں سے وابستہ تھے۔ ایک محبِّ وطن کی حیثیت سے اتحاد جیسے نیک مقصد کے

حصول کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ اسی بنا پر مسٹر گوکھلے نے آپ کو "ہندو مسلم اتحاد" کی علامت قرار دیا۔ میثاقِ لکھنؤ قائداعظم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ اس معاہدہ میں مسلمانوں کے جداگانہ حق انتخاب کو ہندوؤں سے تسلیم کرایا گیا تھا۔ اس پر مسز سروجنی نائیڈو نے قائداعظم کو "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کا خطاب دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ کانگریس صرف ہندوؤں کا ہی فائدہ چاہتی ہے تو آپ اس سے الگ ہو گئے۔ مگر اس کے باوجود "ہندو مسلم اتحاد" کی کوشش جاری رکھی۔ تحریکِ خلافت کا شروع ہونا اور پھر گاندھی کا اس کی قیادت کرنا، ان تمام حالات کا قائداعظم بغور مشاہدہ کر رہے تھے۔ آپ نے لوگوں کو اس میں شامل ہونے سے منع کیا اور خود بھی اس سے دُور رہے۔ کیونکہ آپ سمجھتے تھے کہ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کا جانی، مالی اور تعلیمی نقصان ہوگا اور پھر یہی ہوا۔ تحریک کی ناکامی کے بعد مسلمان مصائب میں گھر گئے۔ آپ تحریک خلافت کے حوالہ سے گاندھی کے منافقانہ کردار کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کانگریس سے دُور ہو گئے۔

نہرو رپورٹ کی اشاعت اور گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کے بعد محمد علی جناح اب ہندوؤں سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ آپ نے اس موقع پر مسلم لیگ کی تنظیم نو کی اور اِس کو صحیح معنوں میں ایک عوامی جماعت بنانے کا ارادہ کیا۔

1935ء کے انتخابات کے بعد مختلف صوبوں میں قائم کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں کے ساتھ مفتوح قوموں جیسا سلوک کیا اور اُن پر بے حد ستم ڈھائے گئے۔ اس ظلم کی وجہ سے مسلمان مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ کانگریسی وزارتوں کے خاتمہ پر مسلمانوں نے قائداعظم کی ہدایت پر یومِ نجات منایا اور اَب ایک الگ وطن کا مطالبہ سامنے آنے لگا۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ تمام مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی جماعت بن گئی۔ اس طرح لاہور میں قائداعظم کی زیرِ صدارت 23 مارچ 1940ء کو منعقد ہونے والے اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور کر لی گئی۔ اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی مسلمانوں کے سامنے اُن کا نصب العین واضح ہوتا چلا گیا اور پھر سات سال کے عرصہ میں پاکستان معرض

وجود میں آ گیا۔ الگ وطن کے حصول کے لیے قائداعظم نے دن رات محنت کی اور اپنی بیماری کو بھی منظر عام پر نہ آنے دیا۔ آخری وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"اگر مجھے پتہ چل جاتا کہ محمد علی جناح ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہیں تو میں تقسیم ہند کے فیصلے کو دو سال کے لیے ملتوی کر دیتا۔ پھر جناح کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جو پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب ہوتی۔"

قائداعظم قیامِ پاکستان کے بعد اُس کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ بڑھاپے اور بیماری کے باعث جسمانی طور پر کمزور ہو چکے تھے۔ مگر مضبوط قوتِ ارادی کی بدولت آخری دم تک قوم کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے۔ قائداعظم جیسی ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ جب تک یہ دُنیا قائم ہے، آپ کا نام زندہ رہے گا۔ آپ کو جو شہرت اور مقبولیت اپنی زندگی اور وفات کے بعد حاصل ہوئی وہ آج تک کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔

زیر نظر کتاب میں محترم سعید راشد علیگ نے قائداعظم کی زندگی کے حوالہ سے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ فاضل مصنف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ پھر درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ آپ کا شمار ملٹری کالج جہلم کے قابل ترین اساتذہ میں ہوتا تھا۔ آپ نے قائداعظم، علامہ اقبال، سرسید احمد خان، تحریک پاکستان اور شہدائے پاکستان پر کئی کتب تالیف کیں۔ جب یقیناً قارئین کے لیے گراں قدر تحفے ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ادارہ بک کارنر جہلم پھر سے ان کتابوں کو خوبصورت اور دیدہ زیب انداز سے شائع کر رہا ہے اور نایاب تصاویر کا اضافہ ان کتابوں کی خوبصورتی اور افادیت کو چار چاند لگا رہا ہے۔ بلاشبہ ان کتابوں کے بغیر پاکستان کی ہر قومی لائبریری نامکمل ہے۔

سیّد اشرف حسین رضوی

(ایم اے ہسٹری)

اسسٹنٹ جنرل منیجر اسٹیٹ لائف، جہلم

سوانحی خاکہ

کسی بڑے آدمی کی بڑائی کا تعلق اس کے بڑے کردار اور بڑے کارناموں سے ہوتا ہے۔ پیدائش کی جگہ، نسل، خاندان یا زبان سے نہیں ۔ پھر بھی جو عقیدت، محبت اور اِرادت ہمیں قائداعظم محمد علی جناح کی ذات اور صفات سے ہے اس کا تقاضا ہے کہ ہم یہ بھی معلوم کریں کہ مٹی کہاں کی تھی؟ یہ کوہِ نور کہاں سے آیا تھا؟ یہ حاصل چمن کس شاخ پہ کھلا تھا؟

خاندانی پس منظر

محمد علی جناح کے دادا پونجا بھائی میگھ جی گجرات کاٹھیا واڑ کے ایک رجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شمار پانیلی کے کھاتے پیتے عزت دار گھرانوں میں ہوتا تھا۔ یہیں ان کا کھڈیوں پر کپڑا بننے کا اچھا کاروبار تھا۔ پونجا بھائی میگھ جی کے تین بیٹے تھے۔ والجی، ناتھو اور جینا۔ یہ تیسرے اور سب

سے چھوٹے جینا بھائی پونجا جو 1850ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ تیز اور ہوشیار تھے۔ ان کا ذہن تجرباتی تھا اور وہ آگے بڑھنے کا غیر معمولی عزم وحوصلہ رکھتے تھے۔ پانیلی کی تنگ دنیا سے نکل کر انہوں نے ریاست کے سب سے بڑے قصبے گونڈل میں تجارت میں قسمت آزمائی کی۔

گونڈل میں ان کی تجارت خوب چمکی لیکن ان کی ہمت، محنت اور حوصلے کی جولانی کے لیے کسی وسیع تر میدان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ گونڈل کو خیر آباد کہہ کے کراچی آکر آباد ہو گئے۔ جینا پونجا نے کھارادر کی نیونہم روڈ پر پتھر اور چونے کی بنی ہوئی ایک بلڈنگ کے دو کمرے کرائے پر لئے اور کاروبار شروع کیا۔ ایک اور روایت کے مطابق پونجا میگھ جی ہی کاٹھیاواڑ سے اپنے تین بیٹوں والجی، ناتھو، جینا اور بیٹی مان جی کو لے کر کراچی آکر آباد ہو گئے تھے اور تجارت کرتے تھے۔

میگھ جی نے اپنے بڑے بیٹے والجی پونجا بھائی کے نام ایک تجارتی فرم بھی قائم کی تھی۔ جو مچھلی، گونداور چمڑا دساور کو بھیجنے کا کاروبار کرتی تھی۔ کچھ بھی ہو اتنا تو ثابت ہے کہ جینا پونجا بھائی، والجی اینڈ کمپنی کے کاروبار میں شریک تھے۔ چمڑے، مچھلی کی تجارت اور بینکاری میں انہوں نے بڑا پیسہ کمایا تھا اور نام پیدا کر لیا تھا۔

جدید تحقیق سے جینا پونجا بھائی کے بارے میں جو دلچسپ اور فکر انگیز انکشافات ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ کراچی کے اولین تعلیمی ادارے، چرچ مشن اسکول میں استاد بھی رہے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسی سکول میں

یا کہیں اور انہوں نے خود بھی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ بہرحال انگریزی وہ ضرور جانتے تھے۔ ایسے کاغذات دریافت ہوئے ہیں جن میں انگریزی میں ان کے دستخط جناح پونجاہ ثبت ہیں۔

جینا پونجا بھائی، جینا سے جناح کیسے بنے؟ اس کی بھی اپنی کہانی ہے پونجا میگھ جی آغا خان اوّل کے معتقد تھے۔ جو ایران سے بلوچستان کے راستے آکر سندھ کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ ایران کے اس امیر کبیر اور عالم خاندان کے متوسل امراء سے پونجا میگھ جی کے خاندان کے قریبی تعلقات تھے۔ اس حد تک کہ جینا پونجا بھائی کی شادی 1874ء میں آغا خاں اوّل کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی شرین بی سے ہوگئی۔ جو اپنے حسن، صورت و سیرت کی وجہ سے اپنی گجراتی سسرال میں مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں۔

اس عالی نسب ایرانی خاندان میں رشتہ ملنے سے جینا پونجا کے گھرانے پر بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ غالباً اسی خاندان سے تعلق کا نتیجہ تھا کہ جینا پونجا نے لفظ جینا کو (جیا یا جیڑان گجراتی میں دُبلے پتلے کو کہتے ہیں) عربی کے جناح سے بدل دیا اور پونجا کو پونجاہ لکھنا شروع کیا۔ جینا سے جناح بننا صرف لفظوں کا فرق نہ تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کاٹھیاواڑ کے اس قدیم خاندان پر جس کا آبائی پیشہ تجارت تھا اب علم و فضل، سیاست اور فراست کے دروازے بھی کھل گئے۔

پیدائش

جناح پونجا کے ہاں نیونہم روڈ پر، چھاگلہ اسٹریٹ والے کرائے کے مکان (وزیر مینشن) میں پیر کے دن دسمبر کی 25 تاریخ 1876ء کو پہلا بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام خاندانی روایت کے مطابق بچہ کے ایرانی ماموں قاسم موسیٰ نے محمد علی رکھا۔ جناح پونجا کے گھرانے میں یہ پہلا خالص اسلامی نام تھا۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے ہاں نام گجراتی میں رکھے جاتے تھے۔ عقیقہ پر بچہ کے نام، محمد علی کے ساتھ جناح بھائی کا اضافہ کیا گیا۔ عقیقہ کے لئے ایک روایت کے مطابق ننھے محمد علی کو خاندان کے آبائی گاؤں پانیلی لے جایا گیا۔ جہاں ایک صوفی خوجے بزرگ حسن پیر کی درگاہ پر روایتی اہتمام سے اس کے عقیقے کی رسم ادا کی گئی۔ بچہ کا نام محمد علی رکھنے اور عقیقے کے لئے اسے صوفی بزرگ کی درگاہ پر لے جانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناح پونجا کے گھر کا ماحول شائستہ اور فضا مذہبی تھی۔

بہن بھائی

محمد علی اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھیں۔ رحمت جو 1878ء میں پیدا ہوئی تھیں پھر بھائی بندے علی، بندے علی کے بعد ایک اور بہن، مریم بی، مریم کی پیٹھ پر احمد علی ہوئے۔ پھر شیریں، شیریں

کے بعد فاطمہ، جو 1892ء میں پیدا ہوئیں اور بعد کو فاطمہ جناح کے نام سے مشہور ہوئیں سب سے چھوٹا بھائی بچو، عقیقے سے پہلے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

ابتدائی تعلیم

محمد علی کی بسم اللہ چھ سال کی عمر میں ہوئی۔ قرآن شریف اور گجراتی پڑھانے کے لئے گھر پر ہی ایک استاد کا انتظام کیا گیا۔ 1882ء میں پرائمری کی تعلیم کے لئے گوکل داس تیج پال اسکول بمبئی میں داخل ہوئے۔ 4 جولائی 1887ء کو انہیں سندھ مدرستہ الاسلام کراچی کے انگریزی کے پہلے درجہ میں داخل کرایا گیا۔ اس سے پہلے وہ گجراتی کے چوتھے درجے تک تعلیم حاصل کر چکے تھے۔

سندھ مدرستہ الاسلام، سرسید کی تعلیمی تحریک کے زیرِ اثر 1885ء میں قائم ہوا تھا اور اس کو قائم کرنے میں جناح پونجا نے جو کبھی خود بھی استاد رہے تھے علمی دلچسپی لی تھی۔ گویا اپنے روشن دماغ باپ کے واسطے سے محمد علی جناح، سرسید کی علمی، فکری اور اصلاحی تحریک سے سیراب ہوئے تھے۔ سندھ مدرسہ میں داخلہ لینے کے چند مہینے بعد وہ دوبارہ بمبئی چلے گئے۔ وہاں تھوڑے دنوں انجمن اسلام ہائی سکول میں پڑھا۔ اسے چھوڑ کر پھر واپس آئے۔

22 دسمبر 1887ء کو دوبارہ سندھ مدرسہ میں نام لکھا لیا۔ یہاں سے انہوں نے انگریزی کا چوتھا درجہ پاس کیا۔ 20 جنوری 1892ء کو جب وہ انگریزی کے

پانچویں درجہ میں تھے تو انہوں نے آخری بار سندھ مدرسہ کو شادی کرنے کے بعد خیر باد کہا۔ شادی کے بعد انہوں نے کراچی کے سب سے پرانے انگریزی اسکول، چرچ مشن اسکول میں 8 مئی 1892ء کو داخلہ لیا۔ 31اکتوبر 1892ء کو اُنہوں نے چرچ مشن اسکول چھوڑا۔ اس وقت وہ انگریزی کے چھٹے درجے میں تھے۔ جسے پری میٹرک کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں ساتویں اسٹینڈرڈ کو میٹرک کہتے تھے۔ گویا اسکول چھوڑتے وقت انہوں نے میٹرک پاس نہیں کیا تھا۔ میٹرک کے معیار کا قانون کے کالج میں داخلہ کا امتحان انہوں نے لندن جا کر پاس کیا۔

بچپن کی عادتیں

مشہور مثل ہے، پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آ جاتے ہیں۔ محمد علی کے ساتھ بھی یہی صورت تھی۔ سب بچوں کی طرح ان کو کھیل سے بھی دلچسپی تھی۔ پتنگ بازی کا شوق بھی تھا۔ خوب کھیلتے تھے۔ لیکن کھیل میں بھی وہ دوسرے بچوں کی کپتانی کرتے تھے اور کھیلتے وقت کبھی کھیل کے اصولوں کو نہیں توڑتے تھے نیونہم روڈ کے دوسرے بچے مٹی اور گرد میں کھیلتے اور لوٹتے رہتے تھے۔ لیکن محمد علی کرکٹ کھیلنا پسند کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے اپنے دوستوں کو مٹی میں گولیاں کھیلنے سے منع کیا اور اپنا گیند بلا دے کر کہا کہ اس سے کھیلو۔ پڑھنے میں ان کی دلچسپی اس حد تک تھی کہ خواہ کتنی رات ہو جائے جب تک وہ اس دن کا کام ختم نہ کر لیتے نہ سوتے۔ چوں

کہ گھر چھوٹا تھا تو اس خیال سے کہ دوسروں کی نیند خراب نہ ہو وہ لالٹین کے آگے گتہ لگا لیتے اور دیر تک پڑھتے رہتے۔ایک بار وہ رات گئے تک پڑھنے میں مصروف تھے ان کی ایک رشتہ دار خاتون کی آنکھ کھلی۔ ننھے محمد علی کو اتنی دیر تک پڑھتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ پیار سے کہنے لگیں:

''بیٹے !اتنی دیر تک نہ پڑھا کرو۔صحت خراب ہو جائے گی۔''

محمد علی نے ادب سے جواب دیا:

''بائی جی! زیادہ نہیں پڑھوں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا۔''

محنت اور جز رَسی کی عادت میں وہ اپنے والد کے نقش قدم پر تھے وہ اپنے پیسوں اور چیزوں کا پورا حساب رکھتے تھے۔ اور سوچ کر احتیاط سے خرچ کرتے تھے۔ بچپن کی یہ عادت ان میں تمام زندگی رہی۔ فضول خرچ نہ وہ پیسے کو کرتے تھے اور نہ وقت کو۔

تیسری عادت جو بچپن ہی میں بہت نمایاں تھی وہ ان کی شائستگی اور نفاست پسندی تھی۔ بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ کپڑے خواہ کیسے ہی ہوں وہ انہیں بہت اچھے طریقے سے پہنتے تھے۔

پہلی شادی

1892ء کے شروع میں محمد علی جناح بھائی کی شادی بمبئی کے مشہور تاجر،

لیرا کھیم جی کی بیٹی، ایمی بائی سے ہوئی، بارات پورے اہتمام سے کراچی سے کشتیوں کے ذریعہ لیرا کھیم جی کے آبائی گاؤں ہریانہ گئی۔ جو کاٹھیاواڑ کے قصبے جام نگر سے کچھ فاصلے پر ہے اور شادی کی رسومات امیرانہ شان سے ادا کی گئیں۔ اس وقت محمد علی کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی اور انہوں نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی۔ دُلہن اس سے بھی کم عمر کی تھیں۔ اصل میں یہ رسمی شادی محمد علی نے اپنی پیاری ماں کے اصرار پر کی تھی۔ جو انہیں پیار سے محمد کہا کرتی تھیں۔ لڑکی کا انتخاب بھی ان ہی کا تھا۔ محمد علی جناح کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ ان کی ساری زندگی میں غالباً یہ تنہا اہم فیصلہ تھا جو ان کے لئے کسی اور نے کیا اور جسے انہوں نے سعادت مندی سے قبول کیا یہ ایمی بائی اگلے سال ان کے لندن روانہ ہونے کے کچھ دنوں بعد ہی (یا ایک روایت کے مطابق چند سال بعد) انتقال کر گئیں۔

میسرز جناح بھائی اینڈ کمپنی

جناح پونجا ایک علمی انسان تھے انہوں نے محنت، ذہانت اور حوصلے سے اتنا کچھ حاصل کیا تھا۔ ہر چند کہ اب 1892ء میں ان کے کاروبار کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو کچھ سال پہلے تھی۔ پھر بھی ان کے ارادے بلند تھے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو بھی ایک بڑا تاجر بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے محمد علی کے لئے وسط 1892ء میں میسرز جناح بھائی اینڈ کو کے نام سے ایک فرم کھول دی۔ اس زمانے میں محمد علی

جناح، چرچ مشن میں انگریزی کے چھٹے درجے کے طالب علم تھے۔اس کمپنی نے اگست 1892ء میں کام شروع کیا۔محمد علی جناح نے اپنی فرم کے لئے نومبر 1892ء تک اپنے دستخطوں سے دو چیک ہنڈیوں کی شکل میں کاٹے جن کا ریکارڈ موجود ہے۔ 31 اکتوبر 1892ء کو انہوں نے چرچ مشن اسکول چھوڑ دیا۔ غالباً سارا وقت تجارتی فرم کو دینے کا خیال تھا۔

انگلستان کو روانگی

جنوری 1893ء میں محمد علی جناح بحری جہاز سے انگلستان روانہ ہوئے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی تجارتی فرم کو فروغ دینے کے لئے 1893ء تک اس فرم نے کچھ کاروبار بھی کیا لیکن اس کے بعد کام بالکل ختم ہو گیا۔ کراچی میں جناح پونجا کی اپنی تجارتی کمپنی دیوالیہ ہو چکی تھی۔ اب محمد علی کے سامنے دو راستے تھے یا خالی ہاتھ واپس آجاتے یا وہاں کچھ کرتے۔ زندگی میں پہلا اہم فیصلہ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ انہوں نے اپنے والد جناح پونجا سے مشورہ بھی کیا ہو گا کہ اب کیا کریں۔ بہرحال خواہ حالات نے مجبور کیا ہو خواہ کسی نے مشورہ دیا ہو، ہوا یہ کہ نوجوان محمد علی جناح بھائی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔ قانون کے کالج میں داخلے کے لئے انہیں میٹرک کے معیار کا داخلہ کا امتحان بھی پاس کرنا تھا۔ مئی

1893ء میں انہوں نے دن رات محنت کر کے داخلہ کا امتحان پاس کر لیا اور 5 جون 1893ء کو لندن کے قانونی تعلیم کے ادارے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا۔

لندن میں قانون کی تعلیم کے ادارے اور بھی بہت سے تھے۔ لنکنز اِن میں داخلہ لینے کی ایک خاص وجہ تھی۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے کچھ عرصہ قبل کراچی بار ایسوسی ایشن کے سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے خود اس امر کی وضاحت کی انہوں نے فرمایا:

> ''ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اکرم ﷺ کی جن کا شمار دنیا کے عظیم مدبروں میں ہوتا ہے، بہت عزت تھی۔ ایک دن میں اتفاق سے لنکنز ان گیا۔ اس کے صدر دروازہ پر دنیا کے نامور قانون سازوں کے نام کندہ تھے اور سرفہرست رسول اللہ ﷺ کا نام نامی تھا۔ میں اس ادارہ سے متاثر ہوا اور میں نے اس میں داخلہ لے لیا۔''

انگلستان میں طالب علمی کا زمانہ

انگلستان کے شدید موسم، تنہائی اور وسائل کی کمی کو انہوں نے حوصلے سے برداشت کیا۔ وہ جس گھر میں کرائے پر رہتے تھے۔ اس میں گرم پانی کا انتظام نہیں تھا۔ ٹھنڈ بہت ہوتی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔

صبح سویرے اٹھنا، غسل کرنا اور دوسرے کاموں کو ایک خاص قاعدے سے وقت پر کرنا لندن میں بھی جاری رکھا۔ لندن پہنچنے کے چند ماہ بعد ہی انہیں دو جذباتی صدمے بھی برداشت کرنے پڑے۔ ایک تو انہیں اپنی پیاری والدہ کی رحلت کی خبر ملی، اور دوسرے وہ بی بی جسے انہوں نے اپنی ماں کی خوشی کے لئے اپنایا تھا وہ بھی نہ رہی۔ یہ دونوں صدمے انہوں نے حوصلے سے برداشت کئے اور اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں جان و دل سے منہمک رہے۔ لیکن وہ کتابی کیڑے بھی نہیں تھے۔ لندن کے سب سے بڑے کتب خانے، برٹش میوزیم میں مطالعہ کا پاس ان کے پاس تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ (ہاؤس آف کامنز) کے مباحث وہ بہت دلچسپی سے سنتے تھے۔ اولڈوک تھیٹر میں شیکسپیئر کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ ایک بار انہیں خود بھی اداکاری کرنے کا خیال آیا۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ:

''لندن میں طالب علمی کے زمانے میں محمد علی جناح نے مشہور قوم پرست رہنما دادا بھائی نوروجی کی انتخابی مہم میں ایک پرجوش کارکن کی حیثیت سے حصہ لیا اور دادا بھائی سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ اس بیان کا پہلا حصہ تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں۔ اگست 1892ء میں دادا بھائی کا انتخاب ختم ہو چکا تھا اور وہ ہاؤس آف کامنز میں بحیثیت ایک آزاد ممبر کے اپنی نشست

سنبھال چکے تھے۔ اس لئے اُن کی انتخابی مہم میں حصہ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دادا بھائی نورو جی سے ارادت کی بات البتہ صحیح ہے۔ دادا بھائی باوقار شخصیت کے حامل آزاد خیال قوم پرست رہنما تھے۔ انگلستان یوں بھی ان دنوں آزاد خیالی (لبرل ازم) کی زد میں تھا۔ نوجوان اور ذہین جناح لبرل قوم پرستی کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ غالباً اسی زمانے میں انہوں نے اپنی زندگی کا دوسرا اہم ترین فیصلہ بھی کیا۔ یعنی ہندوستان کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ، انہیں اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کے لئے متحد ہو کر زبردست جدوجہد کرنا پڑے گی۔ اس جدوجہد آزادی میں وہ خود ایک اہم کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔

ایک موقع پر انہوں نے یہاں تک کہا:

''میری خواہش ہے کہ میں لندن میں قیام کروں اور پارلیمنٹ کا رُکن بن جاؤں اور انگریز مدبروں سے برابر کی سطح پر ملوں۔''

یہ خیالات و احساسات بڑے حیرت انگیز معلوم ہوں گے اگر یہ ذہن میں رکھا جائے کہ اس عزم اور حوصلے کا اظہار کرنے والا ایک تاجر کا بیٹا ہے۔ جو حالات کے تقاضے کے تحت قانون کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور جس کی عمر ابھی بیس سال بھی

پوری نہیں ہونے پائی۔ اپنی غیر معمولی ذہانت اور محنت کی وجہ سے محمد علی جناح بھائی نے قانون کا نصاب وقت سے بہت پہلے ختم کرلیا۔ لیکن بعض رسمی تکلفات کی تکمیل کے لئے انہیں مزید ایک آدھ سال رُکنا پڑا۔ 1896ء کے شروع میں انہوں نے کالج کی کونسل کو درخواست دے کر اپنے نام سے بھائی کا لاحقہ حذف کرادیا اب وہ ایم اے جناح لکھنے لگے تھے۔ 29 اپریل 1896ء کو انہیں بیرسٹری کی ڈگری ملی اور واپس ہندوستان روانہ ہوئے۔

خدا کی شان ہے وہ جو چاہے جس کو دے اور جس سے جو چاہے کام لے۔ موسیٰ آگ لینے گئے تھے کہ پیغمبری ملی۔ ذات کے خوجے محمد علی جناح بھائی ایکسپورٹ کے کاروبار کو چمکانے اور جمانے انگلستان گئے تھے واپس آئے تو ایک روشن دماغ بیرسٹر تھے۔ قوم پرست، آزادی کے جذبے سے سرشار اور ایک نئی دنیا پیدا کرنے کا عزم لئے ہوئے۔

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو مے کدہ سے تو دُنیا بدل گئی

انگلستان سے واپسی

1896ء میں محمد علی جناح بار ایٹ لاء ولایت سے کراچی واپس پہنچے۔ اس عرصے میں والد کا کاروبار بالکل تباہ ہو چکا تھا اور وہ مختلف مقدموں میں پھنسے ہوئے

تھے۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ وہ کراچی میں کسی قانونی فرم سے متعلق ہو کر پریکٹس کریں اور ان کو سہارا دیں اس کا انہوں نے انتظام بھی کر لیا تھا۔ لیکن بیس سال کے اولوالعزم جناح کچھ اور سوچ رہے تھے۔ ان کی نظریں اُفق کے اُس پار کی منزلوں پر تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بمبئی جا کر اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں۔ عزیزوں اور دوستوں سب نے سمجھایا بھی لیکن وہ اپنا ارادہ بدلنے پر تیار نہیں ہوئے۔ انہیں اپنے ارادے پر اعتماد تھا۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

بمبئی کے اپالو ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر اور فورٹ ایریا میں ایک چھوٹا سا دفتر قائم کر کے اور ہائی کورٹ میں نام درج کرا کے انہوں نے 1897ء میں کام تو شروع کر دیا۔ لیکن پریکٹس برائے نام تھی وہ ہوٹل سے کچہری تک پیدل آتے جاتے تھے۔ مقدمہ ملے یا نہ ملے وہ پابندی سے دفتر جاتے تھے اور بیشتر وقت قانونی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے تھے۔ مشکلوں اور آزمائش کا یہ صبر آزما دَور تین سال تک جاری رہا لیکن ان کے حوصلے، وقار یا معیار میں فرق نہ آیا۔ نہ کسی سے گلہ نہ شکایت زمانہ، ان صبر آزما حالات میں بھی انہوں نے اپنے سماجی تعلقات قائم رکھے۔

بمبئی کے اونچے کلبوں میں آتے جاتے۔ ممتاز اور معزز گھرانوں کے یہاں دعوتوں میں شریک ہوتے۔ ان کی پُر وقار اور پُر اثر شخصیت کا ہر جگہ خیر مقدم کیا جاتا خوش لباسی اور نفاست ان پر ختم تھی۔ یہ صفت ان میں تمام زندگی رہی صلاحیت

اور محنت آکر رنگ لاتی ہے۔ بمبئ کا انگریز ایڈووکیٹ جنرل، میک فرسن ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے انہیں اپنے ساتھ کام کرنے اور اپنی لائبریری میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی اپنے مقدمات بھی انہیں دیئے۔ ان مقدمات میں ان کی کارکردگی سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ جلد ہی انہیں پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی ایک عارضی آسامی پر مقرر کر دیا گیا۔ اس کام سے ان کے جوہر کھلے اور ان کی شہرت اور تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ جب اس عارضی آسامی کی مدت ختم ہوئی تو یہ جگہ (اس زمانے کے) پندرہ سو روپے ماہوار کی مستقل ملازمت کے طور پر ان کو پیش کی گئی۔ لیکن قائداعظم نے یہ پیش کش شکریے کے ساتھ مسترد کر دی اور کہا:

''میں اتنی رقم تو ایک دن میں کمانا چاہتا ہوں۔''

اور انہوں نے یہ سچ کر دکھایا۔

1900ء میں پریذیڈنسی مجسٹریٹی چھوڑنے کے بعد ان کی وکالت خوب چمکی اور جب حالات اور بہتر ہو گئے تو انہوں نے والد اور دوسرے گھر والوں کو بمبئی ہی بلا لیا اور خوجے محلے میں ان کی رہائش کا انتظام کیا۔

بحیثیت وکیل کے وہ قانونی مہارت ہی میں نہیں بلکہ اپنی بحث کے تجزیاتی انداز، استدلال اور بے باک انداز بیان کے لئے بھی شہرت رکھتے تھے۔ دیانت، فرض شناسی، حق گوئی میں بھی لاثانی تھے۔ طے شدہ معاوضے سے ایک پیسہ بھی زائد نہیں لیتے تھے اور پوری تندہی اور تیاری کے ساتھ مقدمے لڑتے تھے اس زمانے

میں انگریز جج اور مجسٹریٹ ہندوستانی وکیلوں کے ساتھ اکثر بدد ماغی اور بدتمیزی سے پیش آتے تھے، محمد علی جناح ان کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کی اخلاقی جرأت اور خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کے رویے کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ بددماغ ججوں سے ان کی جھڑپ کے کئی قصے مشہور ہیں۔ اپنی مالی حالت کو مستحکم کرتے ہی انہوں نے عملی سیاست میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ وہ سفر شروع ہو چکا تھا جو آئندہ پچاس برس جاری رہا۔

سیاسی جدوجہد کی داستان

1905ء میں قائداعظم کانگریس کے ممبر بنے۔ 1906ء کے کانگریس کے اجلاس میں انہوں نے دادا بھائی نوروجی کے اعزازی سیکرٹری کی حیثیت سے انجام دیں۔ 1909ء میں مسلم لیگ کی کوشش سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ملا تھا۔ 1909ء کے اسی قانون کے تحت قائداعظم بمبئی کے ایک مسلم حلقہ انتخاب سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1900ء سے ان کی وکالت کا شہرہ برابر بڑھ رہا تھا اور اسی نسبت سے ان کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس خوشحالی میں انہوں نے اپنے گھر والوں کو برابر کا شریک کیا۔ اپنے بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات خود برداشت کیے۔ ان کے لئے والدین کا کردار ادا کیا۔

اس زمانے میں ایک ایسا واقعہ ہوا جو قابل ذکر ہے۔ ان کی چھوٹی بہن رحمت بائی کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ بمشکل ایک اچھا رشتہ ملا، لیکن جب جناح

پونجا کو پتہ چلا کہ لڑکا اسماعیلی خوجہ نہیں بلکہ سنی خوجہ ہے۔تو انہوں نے رشتے سے انکار کر دیا۔ وہ برادری کے ردِعمل سے ڈرتے تھے۔آخرکار محمد علی جناح نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ جب ہر طرح سے لڑکے کے بارے میں اطمینان کر لیا تو باپ سے کہا:

''سنی ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔لڑکا ہر طرح سے موزوں ہے۔''

باپ نے پھر برادری سے نکالے جانے کے اندیشے کا تذکرہ کیا۔محمد علی نے آغاخان سے بات کی۔ ان کی یقین دہانی سے رحمت بائی کی شادی جمال خاندان میں برادری سے باہر ہو گئی۔ اس واقعہ سے محمد علی جناح کی معاملہ فہمی، حقیقت پسندی اور مذہبی بے تعصبی پر روشنی پڑتی ہے۔ذاتی بات ہو یا خاندان کی، یا قوم کی، ہر صورت میں اور ہمیشہ وہ معقولیت اور بے تعصبی کی راہ اختیار کرتے تھے۔

امپیریل کونسل میں وہ جوش وخروش سے گوکھلے کے ساتھ کانگرسی نقطہ نظر کی حمایت کرتے تھے۔گوکھلے ہی نے ان کی آزادی پسند غیر فرقہ واریت کی تعریف کرتے ہوئے انہیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب دیا تھا۔سیاست میں گوکھلے، سرہمرندرناتھ بیز جی اور دادابھائی ان کے ہیرو تھے وہ دل و جان سے آزادی کی منزل کو قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے اور چوں کہ ان کے خیال میں آزادی ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے ہی سے مل سکتی تھی۔ اِس لئے وہ ہندو مسلم اتحاد کے بھی

پُر جوش حامی تھے۔ دسمبر 1906ء میں مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی۔ جناح اس کے باقاعدہ ممبر نہیں تھے۔لیکن مسلم لیگ سے ان کا رابطہ قائم تھا۔

مسلم لیگ کے 1910ء اور 1911ء کے اجلاس میں انہوں نے شرکت کی۔ 1913ء میں مسلم لیگ کے دستور میں ترمیم ہوئی اور قائداعظم کی کوشش سے مسلم لیگ نے بھی حکومت خوداختیاری (سیلف گورنمنٹ) کی قرارداد منظور کی اور ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا۔ 1913ء ہی میں قائداعظم، مولانا محمد علی اور وزیر حسن کے کہنے پر مسلم لیگ کے باقاعدہ ممبر بن گئے اس شرط کے ساتھ کہ مسلم لیگ کی رکنیت کانگریس کی رکنیت سے کسی طرح مزاحم نہیں ہو گی۔ کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں سیاسی جماعتوں نے حکومت خوداختیاری کا مطالبہ پیش کر دیا تھا۔

قائداعظم نے اپنی دو جماعتی رکنیت کو ان دو بڑی سیاسی تنظیموں کے درمیان مفاہمت اور اتحاد کے مقصد کے لئے استعمال کیا۔ اُنہی کی کوشش سے دسمبر 1915ء میں لیگ اور کانگریس کا مشترکہ سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ حکومت اس اتحاد سے خائف تھی۔ چنانچہ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن نے ذاتی دلچسپی لے کر اس اجلاس کو درہم برہم کروا دیا۔ لیکن بعد کو یہ مشترک اجلاس ہو کے رہا۔ یہ بھی جناح کی کامیابی تھی۔ یہیں سے ان کے اور ولنگڈن کے درمیان تعلقات خراب ہوئے۔ مسلم لیگ کے اس اجلاس کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں آزادی کے مطالبے کے پیش نظر قائداعظم نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ

کے لئے اور دونوں قوموں میں اتحاد کے لئے ایک مشترکہ کمپنی بنانے کی جو قرارداد پیش کی تھی اس کی تائید میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک مدلل اور مؤثر تقریر کی تھی۔

دونوں جماعتوں کا مشترکہ اجلاس پھر 30، 31 دسمبر 1916ء کو لکھنؤ میں ہوا۔ لکھنؤ کے اس اجلاس میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مفاہمت ''معاہدہ لکھنؤ'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ، آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کی ذاتی کوشش اور اثر ورسوخ سے ممکن ہوا تھا۔ اس میں کانگریس نے بھی مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول قبول کر لیا۔ جس سے وہ بعد میں منحرف ہو گئی۔ 1919ء کی مان ٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر اس معاہدے کا گہرا اثر پڑا تھا۔

آزادی محمد علی جناح کا مقصود و مطلوب تھی۔ چنانچہ جب 1916ء میں مسز اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کی تو جناح نے اسے بھی منسلک کیا۔ وہ ہوم رول لیگ میں بھی شامل ہو گئے اور ہوم رول لیگ کی بمبئی شاخ کے صدر ہو گئے اور اس تحریک کے سرگرم کارکن 1918ء میں جنگی صوبائی کانفرنس کے موقع پر ان کے اور ولنگڈن کے درمیان پھر ٹکراؤ ہوا۔ انگریز انہیں بائیں بازو کے انتہا پسند عناصر میں شمار کرتے تھے۔ جناح کا رویہ ہر سیاسی معاملے میں دوٹوک اور کھرا ہوتا تھا۔ جب کہ کانگریس کے نئے لیڈر گاندھی ہوا کے موافق اپنا رخ بدلتے رہتے تھے۔ ان کی کسی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لارڈ ولنگڈن نے ہوم رول لیگ، عوام اور جناح کے ساتھ جارحانہ اور

توہین آمیز رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ ذاتی مخالفتوں کو تو نظر انداز کر دیتے تھے لیکن قومی دشمنوں کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب 11 دسمبر 1918ء کو حکومت کے حواریوں نے بمبئی ٹاؤن ہال میں لارڈ ولنگڈن کو جو الوداعی پارٹی دینے کا اہتمام کیا تو قوم پرستوں نے جناح کی راہنمائی میں شدید احتجاج کر کے اس تقریب کو درہم برہم کر دیا۔ ولنگڈن اور سرکاری ملازموں کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس معرکے میں محمد علی جناح کی دوسری بیوی رتی جناح بھی برابر ان کے ساتھ رہیں اور بڑی جرأت سے اس حسین اور نازک خاتون نے اپنے شوہر جناح کا ساتھ دیا۔

رتن بائی بمبئی کے مشہور پارسی اور مالدار لیڈر (Sir Dinshaw Petit) سر ڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ اپنی خوشی سے مسلمان ہوئیں اور 19 اپریل 1918ء کو قائداعظم کے نکاح میں آئیں۔ یہ خاتون اپنے حسن، ذہانت و فراست اور لبرل خیالات کے لئے مشہور تھیں۔ بعد میں آپس میں کچھ اختلافات رونما ہو گئے تھے۔ 1929ء میں رتن بائی کا انتقال ہو گیا۔ ان سے جناح کی ایک بیٹی دینا تھی۔ جسے انہوں نے بڑے چاؤ سے پرورش کیا تھا اور بارہ برس کی عمر میں لندن کے ایک رہائشی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ بعد میں اس اکلوتی بیٹی کو ایک پارسی نیول وادیا سے شادی کرنے پر قائداعظم نے عاق کر دیا تھا۔ لیکن انسانی تعلقات برقرار رکھے۔

اصول کے سامنے قائداعظم بڑی سے بڑی قربانی دے سکتے تھے۔ جذبات انہیں کبھی متزلزل نہیں کر سکتے تھے۔ بحیثیت باپ کے ان کے دل پر خواہ کچھ

بیتی ہو لیکن انہوں نے نافرمانی پر بیٹی کو بھی معاف نہیں کیا۔ بمبئی میں دسمبر 1918ء کے ٹاؤن ہال کے معرکے میں انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی کے ہیرو بن کے اُبھرے۔ اُن کی قائدانہ صلاحیت اور جرأت کا دوست دشمن سب نے اعتراف کیا۔ بمبئی کے شہریوں نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک پیپلز جناح میموریل ہال تعمیر کرایا۔ جس کی رسم افتتاح ممتاز رہنما خاتون اور شاعرہ مسز سروجنی نائیڈو نے ان کی عدم موجودگی میں ادا کی اور انہیں لندن میں تار بھیجا کہ ایک پیغام برکو اس کے اپنے ملک میں اور اپنی زندگی میں اعزاز مل گیا۔

پہلی جنگِ عظیم جاری تھی جنگی کوششوں میں ہندوستانیوں نے مشروط تعاون بھی کیا تھا۔ لیکن معاہدہ لکھنؤ کے اثر سے اور ہوم رول لیگ کی سرگرمیوں میں سے آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی تھی۔ احتجاجی مظاہرے بھی ہونے لگے ان سے نپٹنے کے لئے حکومت نے 1918ء میں رولٹ بل پیش کیا جس میں بنیادی شہری حقوق سلب کر لیے گئے۔ قائداعظم نے امپیریل کونسل میں اس کالے قانون کی ڈٹ کر اور مؤثر انداز میں مخالفت کی، اور جب 1919ء میں اُسے ایک ایکٹ (قانون) کی حیثیت دے دی گئی تو انہوں نے احتجاجاً کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ عوام و خواص مان ٹیگو چیمسفورڈ اسکیم یا اصلاحات سے خوش نہیں تھے۔ جس میں معاہدہ لکھنؤ کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف تمام ملک میں شدید احتجاج کیا گیا۔ حکومت نے

بھی اپنی پوری طاقت اس احتجاج کو دبانے میں صرف کر دی اس جارحانہ پالیسی کا بدترین اور ہولناک مظاہرہ 13 اپریل 1919ء امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں ہوا، اور پنجاب میں سخت ترین مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ لیکن جبر و تشدد کی ہر کارروائی سے عوامی مدافعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس زمانے میں گاندھی کانگریسی سیاست کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے تھے انہوں نے ہوم رول لیگ کو اپنے زیر اقتدار لانا چاہا۔ قائداعظم نے ہوم رول لیگ سے استعفیٰ دے دیا۔

گاندھی سے ان کے اختلافات کھل کر سامنے آئے۔ گاندھی و جناح متضاد شخصیتوں، متضاد طرز فکر اور اصولوں کے حامل تھے۔ سیاست کے ان دو دیو پیکروں کا مقابلہ شروع ہو چکا تھا۔ 1920ء میں ترکی میں خلافت کو بچانے کے لئے مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے مسلمان لیڈروں نے تحریک خلافت شروع کی جس کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں آ گئی۔

نان کوآپریشن موومنٹ (تحریکِ عدم تعاون) اور تحریکِ ہجرت شروع کی گئی۔ محمد علی جناح نے اسی سال اکتوبر 1920ء میں گاندھی اور کانگریس کی آمریت کے خلاف کانگریس سے استعفیٰ بھی دے دیا وہ تحریکِ خلافت سے اختلاف کرنے میں تنہا تھے۔ لیکن بعد کو ان تحریکوں کی ناکامی اور مسلمانوں کو ان سے پہنچنے والے نقصان نے ثابت کر دیا کہ قائداعظم کا نقطۂ نظر ٹھیک تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ انہوں نے تحریک عدم تعاون سے اختلاف ضرور کیا۔

گاندھی کی مخالفت بھی کی لیکن اس تحریک یا اس کے لیڈروں کے خلاف حکومت سے تعاون نہیں کیا جب حکومت نے گاندھی کے مخالفین کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی تو ایک بیان میں کہا کہ عدم تعاون کی تحریک عام بے اطمینانی کی ایک علامت یا اظہار ہے۔ یہ بے اطمینانی رائے عامہ اور بڑے بڑے مسئلوں کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قائداعظم اصولی جنگ لڑتے تھے اور اصول کی خاطر عوام اور خواص دونوں سے اختلاف کرنے اور اس کا برملا اظہار کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ تحریک خلافت میں ان کا کردار ان کی سیاسی فراست اور اخلاقی جرأت کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

ستمبر 1923ء میں وہ اپنے پرانے حلقے سے امپیریل کونسل کی سیٹ کے لئے پھر کھڑے ہوئے۔ اپنے انتخابی منشور میں انہوں نے لکھا:

> ''میں کسی عہدے سے یا خطاب کا خواہاں نہیں ہوں میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی تمام تر صلاحیتیں ملک کی خدمت کے لئے وقت کر دوں۔''

اس وقت کانگریس اور گاندھی سے ان کے شدید اختلافات موجود تھے۔ اس کے باوجود 1924ء میں لیگ کے لاہور کے اجلاس میں قائداعظم نے ایک بار پھر معاہدۂ لکھنؤ کے انداز پر ہندو مسلمانوں میں اتحاد و تعاون پر زور دیا۔ اسی اجلاس میں ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی گئی۔ جو دوسری جماعتوں کے تعاون سے دستوری

اصلاحات کی ایک اسکیم مرتب کرے۔ قائداعظم کو اب بھی یقین تھا کہ جب تک ہندوستان کے عوام متحد نہ ہوں گے یہ ملک غیر ملکی تسلط اور غلبے کا شکار رہے گا۔

دوسری طرف اتنے ہی خلوص اور دیانت داری سے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس اتحاد میں مسلمانوں کے جائز مفادات محفوظ رہیں۔ کانگریس ان کی اتحاد کی کوششوں سے اتفاق کرتی تھی لیکن مسلمانوں کے حقوق کی بات سے بدکتی تھی۔ دائیں بازو کے مسلمان ان کی اتحاد کی کوششوں سے انہیں ہندو نواز سمجھتے تھے۔ حکومت ان کی وطن پرستی اور آزادی کی جدوجہد سے نالاں تھی۔ ہندوفرقہ پرست شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں چلا رہے تھے۔ جولائی 1925ء سے 1927ء تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں خوفناک ہندو مسلمان فسادات بھڑک اُٹھے جن میں زیادہ تر نقصان مسلمانوں کا ہوا، فسادات کا اصل سبب ہندوؤں کا مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کا رویہ تھا۔

دسمبر 1925ء میں وزیر ہند نے اعلان کیا تھا کہ 1919ء کے گورنمنٹ انڈیا ایکٹ کے تحت جلد از جلد آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ 1927ء میں سر جارج سائمن کی سربراہی میں یہ کمیشن ہندوستان آیا۔ جس کی نمائندہ حیثیت نہیں تھی۔

سائمن کمیشن کی غیر نمائندہ حیثیت کے خلاف بحیثیت مجموعی تمام ملک میں احتجاج کیا گیا۔ احتجاج کرنے اور کمیشن سے تعاون نہ کرنے کی مہم میں جناح سب

سے آگے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں دو بنیادی تجویزیں بھی پیش کیں۔ اوّل یہ کہ تمام فرقے اپنے سیاسی اختلاف طے کریں۔ دوم سب فرقے اتفاق رائے سے ایک مسوّدہ آئین مرتب کریں پھر ایک مشترکہ کنونشن میں اُسے منظور کر کے اس آئین کے نفاذ کے لئے جدوجہد کریں 31 مارچ 1928ء کو کمیشن اپنے طور پر کام کر کے واپس چلا گیا۔ قائداعظم نے کمیشن کے خلاف جدوجہد میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں تھیں۔

5 مئی 1928ء کو وہ خود بھی انگلستان روانہ ہو گئے۔ تاکہ کچھ آرام کر سکیں۔ کمیشن کے سامنے متفقہ آئینی مطالبات پیش کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو سکی۔ حالانکہ وہ 20 مارچ 1927ء کی دہلی کانفرنس میں مسلمانوں کے کم از کم مطالبات پیش کر چکے تھے۔ جس میں علیحدہ انتخابات کا حق بعض شرائط کے ساتھ چھوڑنے پر آمادگی ظاہر کی گئی تھی۔ کانگریس نے قائداعظم کی مسلم تجاویز پر غور کرنے کے لئے جو نہرو کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس نے بے حد تنگ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے۔ مسلمانوں کے کم از کم اور نہایت جائز مطالبات کو بھی مسترد کر دیا۔

جناح 16 اکتوبر 1928ء کو انگلستان سے واپس آئے۔ تو انہیں نہرو رپورٹ سے بہت مایوسی ہوئی تاہم وہ آئینی مسئلہ پر ہندو مسلم اتحاد کو اتنا اہم سمجھتے تھے کہ انہوں نے کمیٹی کو متبادل تجاویز پیش کیں لیکن کانگریس نہ مانی۔ چنانچہ مسلم لیگ نے مارچ 1929ء میں نہرو رپورٹ مسترد کر دی اور خود مسلم پوزیشن کو 14 نکات میں پیش

کر دیا جو تاریخ میں قائداعظم کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہیں جن میں بعض یہ ہیں:

۱۔ جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا جائے۔

۲۔ تمام فرقوں کو مذہبی آزادی دی جائے۔

۳۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

۴۔ سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں بھی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۵۔ مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو ایک تہائی سے کم نمائندگی نہ دی جائے۔

۶۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی ملے۔

۷۔ مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دی جائے۔

۸۔ ان کی زبان مذہب اور شخصی قوانین کو فروغ دیا جائے۔

۹۔ مسلمانوں کے تحفظ کے لئے دستور میں مناسب ضمانت دی جائے۔

۱۰۔ تمام مرکزی او رصوبائی حکومت میں مسلمانوں کو ایک نمائندگی دی جائے۔

قائداعظم کے چودہ نکات بڑے فراخ دلانہ تھے۔ ان تحفظات کے ساتھ وہ وفاقی آئین قبول کرنے پر تیار تھے لیکن ہندو کانگریس، مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے ان کے جائز حقوق کی ضمانت دینے کو تیار نہیں تھی۔

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا تاریخی خطبہ

اس سیاسی پس منظر میں دسمبر 1930ء میں یوپی کے مشہور شہر الہٰ آباد میں جو کانگرس کا قلب تھا، مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کی۔

اس اجلاس میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا جس میں آپ نے ہندوستان کی آئندہ دستوری ترقی کا خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے بڑی جرأت سے اعلان کیا۔ ''ہندوستانی مسلمانوں کو اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ پنجاب، سندھ، سرحدی صوبے اور بلوچستان کو آپس میں ملا کر مسلمانوں کے لیے ایک اسلامی ریاست بنادی جائے گی تو میں آزادی کے لیے ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس خطبے میں متحدہ قومیت کے نظریے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا:

> ''مجھے یہ نظر آرہا ہے کہ شمال مغرب میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے۔ اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے مفاد کے پیش نظر ایک متحدہ اسلامی مملکت قائم کی جائے۔''

چودہ نکات کے مسترد ہونے کے بعد اگلا منطقی قدم یہی تھا کہ مسلم قومیت کے تحفظ کے لیے علیحدہ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا جائے۔ لیکن یہ اقبال کا ذاتی خیال تھا۔ مسلم لیگ اب بھی چودہ نکات کی بنیاد پر کانگریس سے مفاہمت پر آمادہ تھی۔

گول میز کانفرنس

سائمن کمیشن کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے برطانوی وزیراعظم میکڈانلڈ کو خط لکھا کہ حکومت کمیشن کی رپورٹ پر فیصلہ کرنے سے پہلے مسلمانوں کے نقطہ نظر اور موقف پر سنجیدگی سے غور کرے اور تجویز پیش کی کہ حکومت تمام متعلقہ پارٹیوں کی کانفرنس بلائے اور نئے سرے سے آئینی مسائل کا جائزہ لے اور اس کانفرنس کے فیصلوں کی روشنی میں نئی آئینی اصلاحات مرتب کی جائیں۔ 14 دسمبر 1930ء کو یہ آئینی کانفرنس لندن میں شروع ہوئی۔ اس کے 57 ہندوستانی نمائندوں میں سے 16 مسلمان تھے۔ جن میں سے قائداعظم، آغا خان، مولانا محمد علی کے نام قابل ذکر ہیں۔

قائداعظم کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہندو لیڈر مفاہمت کے لیے تیار نہ ہوئے اور کانفرنس 19 جنوری 1931ء کو ختم ہوئی۔ قائداعظم لندن میں ہی ٹھہرے رہے اور آغا خان کے ساتھ ہندو وفد سے گفت وشنید کرتے رہے لیکن کوئی نتیجہ

نہیں نکلا ہندو کسی قیمت پر مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ آزادی کی خاطر قائداعظم زیادہ سے زیادہ رعایت دینے پر تھے۔ لیکن ہندوؤں کو یقین تھا کہ وہ سیاسی لحاظ سے مضبوط پوزیشن میں ہیں اور انہیں در پردہ انگریزوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کے علیحدہ انتخاب کا حق تک ماننے کو تیار نہ تھے۔ کانگریس اور ہندو لیڈروں کے رویے سے قائداعظم کو سخت مایوسی ہوئی۔

ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی اس بار قائداعظم نے گاندھی سے براہ راست مذاکرات کیے لیکن گاندھی کانگریس کے متحدہ قومیت کے نظریے پر اڑے رہے اور مذاکرات ناکام ہوئے۔ دوسری گول میز کانفرنس میں علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس کے موقع پر اس کے بعد جناح، اقبال کے سیاسی خیالات سے تفصیل سے مستفید ہوئے۔ قیاس کہتا ہے کہ اقبال نے جناح کو اپنے الٰہ آباد کے خطبے کے تصورات سے آگاہ کیا ہوگا۔ چوں کہ ہندوؤں سے آئینی مفاہمت کے امکانات تقریباً ختم ہو چکے تھے اور قائداعظم گاندھی اور دوسرے ہندو مہا سبھائی لیڈروں کی ذہنیت سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس پس منظر میں قائداعظم نے اقبال کے مکمل طور پر علیحدہ آزاد مسلم ریاست کے قیام کے نظریے پر ضرور سنجیدگی سے غور کیا ہوگا۔

ادھر اقبال کو بھی قائداعظم کی شخصیت اور صلاحیت کو قریب سے دیکھنے کا

موقع ملا ہوگا۔اس دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ایک اور چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جو اس وقت تو چائے کی پیالی میں طوفان ہی نظر آتا تھا۔لیکن درحقیقت ایک بڑے حقیقی طوفان کا پیش خیمہ تھا۔وہ واقعہ یہ تھا کہ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم چودھری رحمت علی اپنے چند دوستوں کے ساتھ اقبال سے ملے اور انہوں نے کانفرنس کے شرکاء کو بھی ایک یادداشت پیش کی جس میں متحدہ قومیت کے نظریے کو مکمل طور پر رد کیا گیا تھا اور دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

اس پمفلٹ میں مسلمانوں کی اس مملکت کا نام ''پاکستان'' بھی تجویز کیا گیا تھا۔گول میز کانفرنسیں ناکام ہوگئیں لیکن اس سے بہت دُور رس نتائج بر آمد ہوئے۔قائداعظم نے دونوں گول میز کانفرنسوں میں جو خدمات انجام دیں اس پر مسز سروجنی نائیڈو نے انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

> ''مقناطیسی شخصیت، موثر انداز بیان اور متوازن و معتدل لہجہ، یہ تھے ان کے تین سرمائے۔ان میں ایک ذہین وکیل کے تمام اوصاف موجود تھے اور گول میز کانفرنس نے انہیں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع دیا تھا۔دلائل پیش کرنے میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت فیصلہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ کسی کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوں۔''

انگلستان میں قیام

دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کی سیاسی صورت حال سے مایوس ہوکر قائداعظم نے انگلستان ہی میں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کیااور پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کی غرض سے لندن کے وہائٹ ہال کورٹ میں رہائش اختیار کر لی۔ 31مارچ کو قائداعظم نے لندن سے آسام کے عبدالمتین چودھری کے نام ایک خط میں لکھا کہ موجودہ حالات میں، میں یہاں رہ کر زیادہ مفید کام کرسکتا ہوں۔ سیاست کا مرکز یہاں ہے۔ دو تین سال میں ہندوستان کی آئینی اصلاحات کے ڈرامے میں یہاں نہایت اہم سرگرمیاں شروع ہوں گی۔

ستمبر 1931ء میں کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آئے بھی لیکن ہندوؤں کے روّیے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ حالات کے جائزے سے مایوس ہوکر واپس لندن چلے گئے اور پریوی کونسل میں وکالت جاری رکھی۔ بالآخر عبدالمتین چودھری اورلیاقت علی خان کے اصرار اوراس یقین دہانی پر کہ مسلمانوں کی اکثریت ان کی راہ نمائی کی خواہاں ہے اور متوقع دستوری اصلاحات کے پس منظر میں ان کی راہ نمائی کی اشد ضرورت ہے۔

قائداعظم اپریل 1934ء میں ہندوستان واپس آئے اور آتے ہی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا اس سال آل انڈیا مسلم لیگ کونسل

کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ اپنے اختلافات بھلا کر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیوں کہ مسلم لیگ ہی مسلم قوم کے حقوق و مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔

اکتوبر 1934ء قائداعظم بمبئی میں اپنے پرانے حلقہ انتخاب سے بلا مقابلہ مرکزی اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے اور اسمبلی میں مسلم ممبروں کی قیادت سنبھال لی۔ اسمبلی میں پھر اُنہوں نے مفاہمت کی کوشش کی۔ ان کی بار بار کوششوں کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ آزادی کو سب سے مقدم سمجھتے تھے اور آزادی ان کے خیال میں بغیر فرقہ وارانہ مفاہمت کے حاصل نہیں ہو سکتی تھی لیکن جب وہ بھی مسلمانوں کے مفادات کے آئینی تحفظ کی بات کرتے تھے۔ ہندو ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے تھے۔ 1935ء کے اوائل میں انہوں نے بمبئی کے ایک جلسہ میں اعلان کیا۔

> ''ہندوؤں کو اپنی ذہنیت بدلنا ہو گی۔ جب یہ عظیم ملک آزاد ہو گا تو کیا ہم ہندوؤں کے محکوم بنیں گے؟ اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت قائم ہو گی۔ جس میں مسلمانوں کو نہ صرف اپنا منصفانہ اور جائز حصہ ملے گا بلکہ انہیں ہندوؤں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔''

اس بیان سے ظاہر ہو گا کہ مسلمان اس وقت بھی 14 نکات پر مبنی بعض بنیادی آئینی تحفظات کے ساتھ وفاقی آئین قبول کرنے کو تیار تھے۔ لیکن ہندو

مسلمانوں کو ان کی علیحدہ قومیت کی بنیاد پر انہیں آئینی تحفظ دینے کو تیار نہیں تھے۔ گویا بنیادی مسئلہ متحدہ قومیت یا علیحدہ قومیت کا تھا۔

2 جولائی کو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء نافذ کر دیا گیا۔ اس سے سیاسی صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ اس کے تحت مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونے تھے اور صوبوں میں نمائندہ حکومتیں قائم ہونا تھیں۔ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائداعظم نے اس ایکٹ کی فیڈریشن والے حصے کی مذمت کی لیکن صوبوں سے متعلق حصے کو غنیمت جان کر لینے کی سفارش کی۔ اپریل 1936ء میں (Lord Linlithgow) لارڈ لنلتھگو وائسرائے نے انتخابات کی تاریخ مقرر کر دی۔ 1936ء کے شروع تک مسلم لیگ ایک منظم جماعت نہیں تھی نہ ہی اس کا عام مسلمانوں سے گہرا رابطہ تھا۔ مسلمانوں کی آئینی جدوجہد کی تاریخ میں ایک اہم موڑ آ گیا تھا۔ اقبال اور قائداعظم دونوں کو اس تاریخی لمحے کی اہمیت کا احساس تھا۔ لیکن بدقسمتی سے اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں نے مختلف مؤقف اختیار کر رکھے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کے لیڈر سر فضل حسین نے ہندوؤں سے مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی تو سندھ میں بہت سے مسلمان سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں سندھ یونائٹیڈ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ بنگالی مسلمانوں کی اکثریت بھی مولوی فضل الحق کی قیادت میں کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ تھی۔ جس کے ممبر ہندو مسلمان دونوں تھے۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کھل کر قائداعظم اور مسلم لیگ کے

مخالف تھے۔ البتہ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کے پر جوش حامی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ خاص طور پر یوپی، بہار اور بمبئی میں ان نامساعد حالات میں قائداعظم نے مسلم لیگ کو ملک گیر سطح پر منظم کرنے اور انتخابات لڑنے کے لئے لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بہت بڑا اقدم تھا جو پورے اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر رکھ کے اُٹھایا گیا تھا اس سلسلے میں علامہ اقبال قائداعظم کی مسلسل راہنمائی اور ہمت افزائی کر رہے تھے۔ جب جون 1936ء میں لاہور میں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا پہلا اجلاس ہوا تو اس میں اکثریتی صوبوں کے مسلمان رہنماؤں کی تعداد مایوس کن حد تک کم تھی۔ فروری 1937ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ کانگریس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل ہوگئی جب کہ مسلم لیگ نے کوئی خاص پوزیشن حاصل نہیں کی۔ مسلمانوں کو بڑی تشویشناک صورت حال کا سامنا تھا۔ کانگریس اپنی طاقت کے نشے میں تھی۔ علامہ اقبال نے محسوس کیا کہ جب تک مسلم عوام لیگ میں شامل نہ ہوں گے وہ ہندوستانی سیاست میں اپنی جائز اہمیت نہیں منوا سکتی چنانچہ انہوں نے 28 مئی 1937ء کو وہ اہم تاریخی خط لکھا جس میں انہوں نے عام مسلمانوں کے مفادات کو بنیاد بنا کر لیگ کو منظم کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

اقبال نے لکھا:

”لیگ کو آخرکار یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا وہ اعلیٰ طبقے کے

ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم رہے گی یا اس میں عام ہندوستانی مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے۔ جنہوں نے اب تک تنظیم سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی سیاسی تنظیم عام مسلمانوں کو راغب نہیں کر سکتی جو ان کے حالات سنوارنے کے عزم کا اعلان نہ کرے۔ نئے دستور کے تحت اعلیٰ عہدے اعلیٰ طبقے کے افراد کو اور چھوٹے عہدے وزیروں کے دوستوں یا عزیزوں کو ملتے ہیں، دوسرے معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمانوں کے حالات سنوارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی ہے۔ عام مسلمانوں کی غربی کا مسئلہ سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے لیکن کون اس مسئلہ کو حل کرنے کا عزم کرے۔ اس مسئلے کا حل اسلام میں موجود ہے لیکن ایک آزاد اسلامی مملکت کے بغیر یہ حل بروئے کار نہیں آسکتا۔ مسلم ہند کے مسائل حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی ازسرنو تقسیم کی جائے اور قطعی اکثریت کے ساتھ ایک یا زائد اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔''

مئی 1937ء میں یہ خط لکھتے وقت خود علامہ اقبال کی صحت جواب دے رہی تھی۔ لیکن ملک کی نازک صورتحال کے پیش نظر انہوں نے کچھ عرصے کے بعد

پھر قائداعظم کو لکھا:

''اس وقت ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جن کی ذات سے قوم بجا طور پر یہ توقع کرسکتی ہے کہ شمال مغربی ہند بلکہ پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے جو طوفان آرہا ہے اس میں آپ اس کی راہ نمائی فرمائیں گے۔''

قائداعظم نے آنے والے سیاسی طوفان میں مسلمانوں کی جس طرح راہ نمائی کی اس سے ثابت ہوا کہ اقبال کا اعتماد غلط نہیں تھا۔ جولائی 1937ء میں کانگریس نے سات صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں حکومت بنانے کا موقع ملتے ہی کانگریس نے پہلا کام تو یہ کیا کہ باقی چار صوبوں میں مسلم لیگی ممبروں کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں جہاں مسلم لیگ کو خاص نشستیں مل گئی تھیں۔ اُمید کی جاتی تھی کہ لیگ کو کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ خاص طور پر یو پی میں جہاں انتخابات سے پہلے لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ہوگئی تھی اور دونوں کے امیدواروں نے انتخابات ایک ٹکٹ پر لڑے تھے لیکن کانگریس نے مفاہمت کا لحاظ نہیں کیا اور حکومت میں شامل کرنے کے لئے مسلم لیگ کے سامنے ایسی شرائط رکھیں جو اس کی سیاسی موت کے مترادف تھیں۔

مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کو سیاسی قوت کے طور پر بالکل ختم کر دیا جائے۔ کانگریس کے اس رویے اور بدعہدی نے قائداعظم کو آخر کار حتمی طور پر قائل کر دیا کہ ہندو کانگریس سے کوئی توقع رکھنا بے کار ہے۔ ہزار بار کی مفاہمت کی کوشش کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ اب اس کے بغیر چارہ نہیں رہا تھا کہ مسلمان اپنی سیاسی قوت سے اپنے قومی وجود کا تحفظ کریں۔

1937ء کا تاریخی خطبۂ صدارت

اکتوبر 1937ء میں لکھنو میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائداعظم اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

> ''واقعات اور حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس سے کسی انصاف کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ میں چاہتا ہوں مسلمان خود اپنے اوپر بھروسہ کریں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو حوصلہ مند اور پختہ عزم کے مالک ہوں جو اپنے اصولوں کے لیے جدوجہد کر سکیں۔ خواہ پوری دنیا ہمارے خلاف کیوں نہ ہو ہمیں قوت اور اتحاد درکار ہے اور یہ قوت عوام کے تعاون اور اتحاد کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔''

انہوں نے اپنا خطبہ صدارت ان الفاظ پر ختم کیا

میں ہر مرد، عورت اور بچے سے اپیل کرتا ہوں کہ مشترکہ پلیٹ فارم پر آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں جس قدر جلد ہو سکے اپنے آپ کو منظم کر لیجیے اور پوری طرح متحد رہیے تربیت یافتہ اور منظم سپاہیوں کی طرح ہر وقت چوکس رہیے اپنے حلقوں میں سپاہیانہ سپرٹ اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کیجیے اپنے ملک اور عوام کی تندہی اور فرض شناسی کے جذبے کے ساتھ خدمت کیجیے محنت، جفاکشی اور قربانیوں کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لوگ آپ کو ڈرائیں گے، بہلائیں گے پھسلائیں گے، اور شاید آپ کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے مگر یاد رکھیے کہ آگ میں تپ کر ہی لوہا کندن بنتا ہے ظلم و ستم، دھمکی، ترغیب، تحریص کے جال میں نہ پھنسیے۔ اپنے ارادے پر جمے رہیے۔ یقین کیجیے رنج وآلام اور آزمائش کے اس دور کے بعد ایک ایسی قوم نمودار ہوگی جو اپنی گذشتہ عظمت اور تاریخ کے شایان شان ہوگی اور اس عظمت میں چار چاند لگانے کے لیے زندہ رہے گی ہندوستان کے آٹھ کروڑ

مسلمانوں کو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا
مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے وہ منظم اور متحد ہوکر ہر خطرے
کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نصب العین کا دفاع کرنے کی طاقت
رکھتے ہیں۔''

قائداعظم کا یہ خطبہ مسلم لیگ کے آئندہ لائحہ عمل کا خاکہ تھا۔ گاندھی نے قائداعظم کو لکھا:

''جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کی پوری تقریر اعلانِ جنگ
ہے۔''

گاندھی کا یہ سمجھنا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا قائداعظم فیصلہ کر چکے تھے کہ اب جدّ وجہد کا رخ کیا ہوگا۔

پِیرپور رپورٹ

سات صوبوں میں کانگریس وزارتوں کے چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ مسلم لیگ کو ہندوؤں اور کانگریسیوں کی زیادتیوں اور نا انصافیوں کی شکایتیں بڑے پیانے پر ملنے لگیں۔ خاص طور پر سی پی، بہار اور یوپی میں نہ صرف مسلمانوں پر ظلم ڈھائے جا رہے تھے بلکہ ان کی تہذیب کو ہندوانہ رنگ دینے کی تدبیریں کی جا رہی تھیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ان شکایات پر غور کیا اور ان کی تحقیق کے

لیے 20 مارچ 1938ء کو راجہ صاحب پیر پور کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی اس کمیٹی نے کانگریسی اکثریت کے صوبوں کا دورہ کیا اور 15 نومبر 1938ء کو اپنی رپورٹ پیش کر دی اس پیر پور رپورٹ نے بیشتر شکایات کو صحیح بتایا اور تصدیق کی کہ مسلمان بچوں کو بندے ماترم پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بیشتر مقامات پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کانگریسی وزارتیں اردو کو مٹانے کے درپے ہیں۔

تیسری پارٹی

پیر پور رپورٹ کے بعد ایک پھر لیگ اور کانگریس میں مذاکرات ہوئے لیکن کانگریس نے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت ماننے سے انکار کر کے مفاہمت کا آخری موقع گنوا دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر اعلان کیا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ''کانگریس اور حکومت برطانیہ''

قائد اعظم نے فوراً للکارا:

''یہ غلط ہے، ہندوستان میں ایک تیسری پارٹی بھی موجود ہے۔
یعنی مسلمان ''ہم کسی کے محکوم نہیں رہیں گے''

اکتوبر 1937ء میں مسلم لیگ کو بنگال اور پنجاب کے وزراء اعلیٰ کا تعاون

حاصل ہو گیا سندھ میں بھی مسلم لیگ کا اثر بڑھنے لگا تھا۔ یہ صرف قائداعظم کی موثر قیادت کا کرشمہ تھا کہ مسلم لیگ، مسلم اکثریت کے صوبوں میں ماسوائے سرحد، ایک قوت کی حیثیت سے اُبھر رہی تھی۔

22 اکتوبر 1939ء کو کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا تو 22 دسمبر 1939ء کو لیگ نے پر امن طریقے سے یوم نجات منایا۔ اس سے پہلے 17 اکتوبر 1938ء کو قائداعظم کی صدارت میں سندھ مسلم لیگ ایک قرارداد منظور کر چکی تھی کہ برصغیر کی دو قوموں کی متوازی آزادی اور ترقی کے لیے کوئی نیا آئینی حل تلاش کیا جائے۔ اسی قرارداد کی روشنی میں مسلم لیگ کونسل نے ایک آئینی کمیٹی 1939ء کے اواخر میں قائم کی۔

قراردادِ پاکستان

اسی دستور کمیٹی کی سفارشات 23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں اس مشہور تاریخی قرارداد کی شکل میں پیش کی گئیں جو اب قرارداد لاہور اور قرارداد پاکستان کے نام سے معروف ہے۔ اس قرارداد میں کھل کر دو قومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کو بعض رہنما اصولوں کے تحت دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی متفقہ آواز تھی اور اس کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے قائداعظم کی حمایت حاصل تھی سارے مسلم راہنماؤں اور

ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو کانگریسی وزارتوں کے تجربے سے یقین ہو گیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں وفاقی آئین کے تحت مسلمان ہمیشہ ہمیشہ ہندو اکثریت کے محکوم رہیں گے اور رفتہ رفتہ ان کی قومی انفرادیت ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا وہی واحد آئینی حل تھا۔ جو 1930ء میں علامہ اقبال نے اور 1932ء میں چودھری رحمت علی نے پیش کیا تھا۔ یعنی دوقومی نظریے کی بنیاد پر بعض رہنما اصولوں کے تحت برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کی تخلیق۔

23 مارچ 1940ء کی قرارداد کا مسودہ تیار کرنے میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان بھی شریک تھے۔ قرارداد کو قائداعظم نے آخری شکل دی۔ اس کو بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے اجلاس میں پیش کیا۔ یوپی کے چودھری خلیق الزماں نے تائید کی اُس کے بعد ہندوستان کے دوسرے حصوں کے رہنماؤں نے تائید میں تقریریں کیں۔

قرارداد پاکستان پر قائداعظم کی تقریر

قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی زندگی کی بہترین تقریر اس موقع پر کی، آپ نے فرمایا:

> ''مسلمان اقلیت نہیں ہیں مسلمان صحیح معنوں میں ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اس ملک کے بڑے علاقے میں آباد

ہیں جہاں ہم اکثریت میں ہیں مثلاً بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان، ہندوستان کے مسئلے کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں بلکہ دو قومی ہے۔ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا صرف یہی حل ہے کہ برصغیر کو خودمختار قومی ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔''

اس طویل قرارداد کے اہم نکات صرف دو تھے:

1۔ مسلم اکثریت کے علاقوں میں دو آزاد ریاستیں قائم کی جائیں۔

2۔ مسلم اکثریت کے ان علاقوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو مناسب تحفظات دیئے جائیں۔

اسی طرح ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مفادات کا ضروری تحفظ کیا جائے۔ 23 مارچ 1940ء کو اس قرارداد کا منظور ہونا تھا کہ کانگریس اور ہندو میڈیا نے شدید ترین ردعمل کا اظہار کیا۔ سارا ہندو پریس اس قرارداد، مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف حرکت میں آ گیا۔ ہندو نفرت اور حقارت سے کہتے کہ اس قراداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کا وجود میں لانا ناممکن ہے۔ اگرچہ قرارداد میں پاکستان کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن قرارداد پاکستان سے بڑھ کر اس کا موزوں نام کیا ہوسکتا تھا۔ چنانچہ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اقبال کے دیئے ہوئے اس نصب العین کو چودھری رحمت کے وضع کیے ہوئے لفظ پاکستان سے

موسوم کرنا شروع کر دیا۔ اس نام میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں پاکستان کا لفظ ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ صدیوں سے مسلمانوں کو جس منزل کی تلاش تھی وہ اب ان کے سامنے تھی۔

قرارداد پاکستان کی منظوری کے زمانے میں برطانوی حکومت دوسری جنگ عظیم کے بدترین دور سے گذر رہی تھی اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ہندوستان کا تعاون جنگی کوششوں میں حاصل کیا جائے۔ اُدھر کانگریس اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انگریزوں پر دباؤ ڈال رہی تھی۔ اس عرصے میں کانگریس اور لیگ میں پھر مذاکرات ہوئے۔ لیکن کانگریس، مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے کو اب بھی تیار نہ تھی۔ مسلم لیگ مشروط طور پر حکومت سے تعاون کرنے پر تیار تھی۔

جب سر سکندر اور مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ کی ہدایات کے خلاف وائسرائے کی جنگی کونسل کی رکنیت قبول کی، تو لیگ نے دونوں کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اس عرصے میں کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک شروع کی۔ اور بہت سے تشدد کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ تحریک تو بڑی حد تک ناکام ہوگئی۔ لیکن مشرق بعید میں جنگ کی صورتِ حال بگڑنے اور برما تک جاپانیوں کی یلغار نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا وہ ہندوستان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے آئینی مفاہمت کی کوئی صورت پیدا کرے۔

چنانچہ مارچ 1942ء میں مسٹر اسٹیفورڈ کرپس نئی آئینی اصلاحات کا جائزہ لینے ہندوستان آئے اور اہم لیڈروں سے صلاح مشورہ کیا۔ کرپس نے جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں تقسیم کے اصول کو قبول کرنے کا اشارہ تو موجود تھا لیکن اس سے مسلم لیگ مطمئن نہیں تھی ادھر کانگریس ایک قومی نظریے کے تحت ہندوستان کو متحد رکھنے پر مصر تھی۔ نتیجتاً کرپس تجاویز پورے طور پر کسی نے قبول نہیں کیں اور یہ مشن ناکام ہوگیا۔ سیاسی مذاکرات کے اس نازک دور میں قائداعظم مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی پوزیشن مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے مطالبہ پاکستان کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ بنگال میں بھی مسلم لیگ ایک طاقت بن کر ابھر رہی تھی۔

قاتلانہ حملہ

26 جولائی 1943ء کا واقعہ ہے قائداعظم مالا بارہل پہ واقع اپنی کوٹھی کے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ دوپہر کے وقت ایک اجنبی مکان میں داخل ہوا اور کہا کہ وہ قائداعظم سے ملنا چاہتا ہے بڑے دروازے کا پٹھان چوکیدار اجنبی کو لے کر قائداعظم کے سیکریٹری مطلوب الحسن سید کے پاس آیا۔ اجنبی نے سیکرٹری سے بھی یہی کہا کہ میں قائداعظم سے ملنا چاہتا ہوں۔ سیکرٹری نے اسے بہت سمجھایا کہ قائداعظم پہلے مقرر کر کے لوگوں سے ملتے ہیں اور یہ کہ اگر آپ اپنی آمد کا مقصد تحریر

کردیں تو میں تاریخ اور وقت مقرر کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مطلع کر دوں گا۔اتنے میں قائداعظم کسی فائل کی تلاش میں اپنے سیکریٹری کے کمرے میں داخل ہوئے قائداعظم کو دیکھتے ہی وہ شخص چیخ چیخ کران سے کہنے لگا کہ:

''مجھے چند منٹ دے دیجئے۔''

قائداعظم نے انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا:

''میں آج بہت مصروف ہوں میرے سیکرٹری آپ کو وقت دے دیں گے۔''

اس پر اس نے جیب سے لمبا چاقو نکال لیا اور قائداعظم پر حملہ کرنے لیے جھپٹا۔قائداعظم نے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔خوش قسمتی سے اس کا نشانہ چوک گیا۔ قائداعظم کے سیکرٹری اور چوکیدار نے اگرچہ حملہ آور پر قابو پالیا تاہم قائداعظم کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔حملہ آور کا نام رفیق صابر تھا وہ لاہور سے بمبئ آیا تھا اس کا تعلق خاکسار تحریک سے تھا۔

مسلم لیگ کا عروج

1937ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلم اکثریتی صوبوں میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی۔1943ء تک سندھ، بنگال، آسام میں مسلم لیگ کے زیر اثر حکومتیں قائم

ہوگئیں ۔سرحد اور پنجاب میں مسلم لیگ کے اثر و رسوخ میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہوا کہ قائداعظم کی دُور رس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اکثریتی صوبوں کی بھرپور حمایت کے بغیر پاکستان کا مطالبہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔اس حکمت عملی کے تحت قائداعظم نے اپنی توجہ ان صوبوں پر مرکوز کی اور انہیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔

فروری 1944ء میں نئے وائسرائے لارڈ ویول(Lord wavell) نے مرکزی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا'' آپ جغرافیے کو نہیں بدل سکتے ہندوستان ایک قدرتی وحدت ہے۔''قائداعظم کا تبصرہ لارڈ ویول کانگریس سے ساز باز کر رہے ہیں'' 4 جون 1945ء کو لارڈ ویول نے ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا کوئی حل ڈھونڈنے کے لیے ممتاز لیڈروں کی کانفرنس شملہ میں طلب کی یہ کانفرنس بھی ناکام ہوگئی کانگریس اب بھی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت قبول کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اصل میں دو قومی نظریے اور پاکستان کے مطالبے کی تردید کرنا چاہتی تھی۔ بدقسمتی سے بعض کانگریسی مسلمان بھی ہندوؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

اس صورت حال کا واحد حل یہی تھا کہ انتخاب لڑکر دیکھ لیا جائے کہ کون کس کے ساتھ ہے۔دسمبر 1945ء کی آخری تاریخوں میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کی تقریباً تمام

نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں کے انتخابی حلقوں سے مسلم لیگ کو 87 فیصد ووٹ ملے۔ قائداعظم نے اعلان کیا کہ خدا نے مسلمانوں جو کامیابی عطا کی ہے اس پر اظہار شکر گذاری کے طور پر مسلمان 11 جنوری 1946ء کو یوم فتح منائیں اور مسجدوں میں سجدۂ شکر ادا کریں۔

25 دسمبر 1945 کو قائداعظم نے بمبئی میں اپنی سترویں سالگرہ منائی۔ اس موقع پر میمن تاجروں کے ایوانِ تجارت نے انہیں چائے پر مدعو کیا۔ سپاس نامے کے جواب میں انہوں نے جو تقریر کی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ستر سال کی عمر ہونے کے باوجود ان میں جوانوں کا سا عزم اور جذبہ موجود ہے۔ انہوں نے اپنی گرج دار آواز میں کہا:

> ''اگر ہماری جدوجہد آزادی میں ہندو ہمارا ساتھ نہیں دیتے تو مسلمان اور مسلم لیگ تنہا ہی پاکستان اور آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں گے۔''

قائداعظم کی راہ نمائی میں مسلم لیگ کی مقبولیت اصل میں نظریہ پاکستان کی مقبولیت تھی۔

فیصلہ کن انتخابات

اوائل 1946ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہونا تھے۔ کانگریس نے

اپنے سارے وسائل مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے داؤ پر لگا دیئے لیکن مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اور مسلمانوں کے پاس وسائل کم لیکن حوصلہ اور جوش و ولولہ بہت زیادہ تھا علی گڑھ اور لاہور کے مسلمان طالب علم مسلم لیگ کا پرچم لے کر گاؤں گاؤں، قریہ قریہ گھومنے لگے۔ ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے ایک ہی آواز آتی ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' انتخابات کی اس مہم میں مسلم اقلیتی صوبوں میں جوش و خروش اکثریتی صوبوں سے بھی زیادہ تھا۔ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ پاکستان کس علاقے میں بنے گا مسئلہ یہ تھا کہ مسلم قوم کو ایک وطن ملے گا۔ اسلام کے نام پر ایک آزاد ریاست قائم ہوگی۔

عام انتخابات میں مسلم لیگ کو بحیثیت مجموعی زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخابات کے نتائج سے ثابت ہوگیا تھا کہ مسلمانان ہند کی غالب اکثریت مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ کو وزارت بنانے کا موقع بھی ملا۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی 86 نشستوں میں سے 79 حاصل کی تھیں۔ برطانیہ کی لیبر حکومت ہندوستان کو جلد سے جلد خود اختیاری دینے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ برطانوی حکومت نے اعلیٰ اختیارات کا ایک وفد مارچ 1946ء میں ہندوستان بھیجا۔ اس وفد نے جو کیبنٹ مشن کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان کے سب اہم لیڈروں سے بات چیت کی مشن نے اعلان کیا

مشن یہ معلوم کرنا چاہتا ہے ہندوستان میں اقتدار کس طرح اور کیسے منتقل

کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اہل ہند کو سونپ دی جائے۔ مشن نے وضاحت کی کہ اگر اختیارات کی منتقلی کے سوال پر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی تو مجبوراً حکومت برطانیہ خود کوئی فیصلہ کرے گی۔ کیبنٹ مشن کے رویے سے ظاہر تھا کہ ہندوستان کی آزادی کی منزل بالکل قریب ہے لیکن حکومت کیسے منتقل کی جائے گی یہ طے ہونا باقی تھا۔ کانگریس اور دوسرے ہندوؤں کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ہندوستان متحد رہے اور اس کی ایک آئین ساز اسمبلی ہو کیبنٹ مشن پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔

بڑا نازک وقت تھا برطانوی حکومت کا رجحان خود بھی متحدہ ہندوستان ہی کی طرف تھا۔ قائداعظم نے نہایت دور بینی اور فراست سے کام لیتے ہوئے ٹھیک اسی وقت مسلم لیگ کی طاقت کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اپریل 1946ء کو دہلی میں ہندوستان بھر کے منتخب مسلمان ممبروں کا کنونشن بلایا۔

اس کنونشن میں پہلے تو قرارداد لاہور میں جو دو آزاد ریاستوں کا لفظ تھا اسے لفظ ریاست سے بدلا گیا۔ تاکہ ایک ملک پاکستان کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ رہے دوسرے صاف اعلان کیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان کے لیے دو علیحدہ علیحدہ آئین ساز اسمبلیاں بنائی جائیں اس اجتماع میں شریک تمام نمائندوں نے ایک عہد نامے پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ ان کا ایمان ہے کہ پاکستان اور صرف پاکستان ہی مسلمانانِ ہند کی نجات کا راستہ ہے اور حصول پاکستان کی جدوجہد

میں وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے مشن نے مفاہمت کے لیے کئی تجویزیں پیش کی۔ لیکن قائداعظم محمد علی جناح مطالبہ پاکستان سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر کار مختلف مذاکرات کے ناکام ہونے کے بعد کیبنٹ مشن نے خود ایک منصوبہ پیش کیا جس میں پاکستان کا اصول اور بنیاد موجود تھی۔ ملک کو تین منطقوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ہر حصے کو کچھ عرصے کے بعد وفاق سے علیحدگی کا حق دیا گیا تھا۔

کیبنٹ مشن کے پلان میں ایک عبوری حکومت کی تجویز بھی تھی کچھ جرح اور کچھ شرطوں کے ساتھ مسلم لیگ اور کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو قبول بھی کرلیا۔ لیکن کانگریس کا دل صاف نہیں تھا۔ 8 جولائی 1946ء کو پنڈت نہرو نے کیبنٹ مشن پلان کے تحت مجوزہ دستور ساز اسمبلی کے اختیارات کی اس طرح توجیہہ کی کہ قائداعظم کو شبہ ہو گیا کہ کانگریس، مشن پلان سے اپنا مطلب نکالنا چاہتی ہے ادھر برطانوی پارلیمنٹ میں مشن سربراہ نے انکشاف کیا کہ حکومت، مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی مکمل تائید نہیں کرتی ہے۔

اب مسلم لیگ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ مشن کے پلان کی منظوری سے دستکش ہو جائے۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کو بددیانتی اور بدنیتی دونوں سے نمٹنا تھا۔ مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگیوں نے برطانوی حکومت کے خطابات واپس کردیے۔ 16 اگست 1946ء کو سارے مُلک

میں یومِ راست اقدام منایا گیا۔ پاکستان کے قیام کی ضرورت اور مسلم لیگ کی منظور کردہ قرارداد کی وضاحت کی گئی۔ کیبنٹ مشن پلان کے تحت 2 ستمبر کو کانگریس نے عبوری حکومت میں شرکت کی۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں وائسرائے کی بعض یقین دہانیوں کے بعد قائداعظم نے بھی مسلم لیگ کے پانچ نمائندوں کو عبوری حکومت کے لیے نامزد کر دیا۔ جن میں لیاقت علی خاں بھی تھے مقصد یہ تھا کہ عبوری حکومت میں کانگریس من مانی نہ کر سکے اور مسلم لیگ کی سیاسی قوت کا عملی مظاہرہ ہو۔

اس مشکل زمانے میں قائداعظم کی سیاسی فراست اور تدبر پر آغا خان نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''قائداعظم کی تابناک اور عہد آفریں شخصیت 46 اور 47 کے اہم سالوں میں اپنے عروج پر تھی۔''

منزل قریب تر:

چوں کہ کانگریس نے 16 مئی 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کو مشروط طریقے سے قبول کیا تھا۔ اس لیے مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی کے دسمبر 1946ء کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا۔ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ برطانوی کابینہ کا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر

حکومت برطانیہ نے اقتدار اور اختیارات کی حتمی تاریخ جون 1948ء مقرر کر دی تا کہ مجبوراً دونوں جماعتیں مفاہمت کی کوئی صورت نکالیں۔

تقسیم ہند کا منصوبہ

24 مارچ 1947ء کو نئے وائسرے لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mountbatten) نے عہدے کا چارج لیتے ہی اقتدار منتقل کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایک وفاقی دستور کے تصور کو ترک کر کے ایک متبادل منصوبہ تیار کیا جس کے تحت صوبوں یا صوبوں کو فیڈریشن کے اختیارات منتقل کرنے تھے بشرطیکہ صوبے کوئی فیڈریشن بنا سکیں۔

تاہم پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے دو حصے کیے گئے تھے یعنی مسلم حصہ اور غیر مسلم حصہ اور اگر دونوں حصوں نے یہ طے کیا کہ ان صوبوں کی تقسیم کی گئی تو آسام میں مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کو پاکستان کے ساتھ شمولیت کا حق دیا جائے گا۔ بشرطیکہ سلہٹ اس ضمن میں یہ فیصلہ کرے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کی رائے شماری کرائی جائے گی۔ اس تجویز پہ کچھ دنوں بحث وتکرار ہوتی رہی اب برطانوی حکومت ہر قیمت پر جلد سے جلد اقتدار منتقل کرنا چاہتی تھی۔ آخر کار 2 جون 1947ء کو وائسرائے نے نئی دہلی میں لیگ اور کانگریس کے نمائندوں اور سکھوں کے ایک نمائندے کو حتمی مذاکرات کے ایک اجلاس میں طلب کیا۔ اس نے

جو منصوبہ پیش کیا وہ یہ تھا۔

۱۔ تقسیم کا اصول قبول کر لیا گیا ہے۔

۲۔ تقسیم کی صورت میں دونوں مملکتیں آزاد ہوں گی۔

۳۔ انہیں مکمل ڈومینین (Dominion) کا درجہ دیا جائے گا اور انہیں دولتِ مشترکہ سے علیحدگی کا حق ہوگا۔

۴۔ بنگال، پنجاب اور ریاستوں کے متعلق کیبنٹ مشن پلان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

اسمبلیوں میں مسلم اکثریت کے ضلعوں کے نمائندے خود فیصلہ کریں گے کہ آیا موجودہ دستور ساز اسمبلی آئین بنائے یا اس مقصد کے لیے نئی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کی جائے۔

ان اسمبلیوں کے مسلم ممبروں کے علیحدہ اجلاس ہوں گے اور یہ طے کیا جائے گا کہ آیا صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ سندھ اسمبلی بھی اس سوال پر خود فیصلہ کرے گی۔ سرحد میں بھی رائے شماری ہوگی اور برطانوی بلوچستان کے لیے گورنر جنرل تجاویز مرتب کریں گے۔ اس تقسیم کا فیصلہ ہوا تو آسام کے ضلع سلہٹ میں رائے شماری ہوگی۔ اگر اس طریق کار کے مطابق یہ طے ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیے اور بنگال و پنجاب کو بھی تقسیم کیا جائے تو اس مقصد کے لیے سرحدوں کی حد بندی کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ اقتدار کی منتقلی 14 اگست 1947ء

تک مکمل ہو جائے گی۔

اس اسکیم کو ان حالات میں بہترین اور ممکن حل سمجھ کر قائداعظم نے بھی قبول کرلیا جو خیال اقبال نے 1930ء میں ایک آرزو کے طور پر پیش کیا تھا وہ تصور قائداعظم کی بے مثال قیادت میں ایک حقیقت کے طور پر پاکستان کی شکل میں سامنے آ گیا۔

3 جون 1947ء کی رات کو پہلے لارڈ ماونٹ بیٹن نے منصوبے کی تفصیلات کا اعلان کیا جس میں سب سے اہم نکتہ دو خود مختار مملکتوں کو برطانوی اقتدار منتقل کرنے کا تھا۔ ماونٹ بیٹن کے بعد پنڈت نہرو نے کانگریس کی طرف سے تقریر کی۔ نہرو کے بعد قائداعظم نے مسلمان قوم سے خطاب کیا اس موقع پر ان کی آواز خلوص اور عاجزی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

> ''میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس نازک مرحلے پر وہ ہماری راہ نمائی کرے اور ہمیں دانشمندی اور تدبر کے ساتھ ذمہ داری سنبھالنے کی توفیق فرمائے۔''

منصوبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

> ''بعض پہلوؤں پر یہ منصوبہ مسلم لیگ کے موقف پر پورا نہیں اترتا۔''

اس موقع پر انہوں نے پاکستان کی خاطر قربانیاں دینے والوں کو بھی یاد

رکھا۔ قائداعظم نے اپنی یادگار تقریر ان دو الفاظ پر ختم کی جو تقریر کے مسودہ میں شامل نہیں تھے ''پاکستان زندہ باد ...... پاکستان زندہ باد'' سن کر کروڑوں مسلمانوں کے سر سجدہ شکر بجالانے کے لیے جھک گئے۔

آزادی کی تاریخ 14 اگست 1947 مقرر ہوئی 1947ء کے آخر میں قائداعظم نے پاکستان کے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالنے کا فیصلہ کیا۔ ملک کے حالات اور ماونٹ بیٹن کے رویے کے پیش نظر یہ بہت صحیح فیصلہ تھا۔

قاتلانہ حملے کی سازش:

7 اگست 1947ء کو اپنے عملے کے ساتھ کراچی روانہ ہونے سے دو روز پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو ایک نجی ملاقات میں بتایا کہ محکمہ سراغ رسانی کی اطلاعات کے مطابق ان کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ ان منصوبوں میں سکھ لیڈروں کا ہاتھ بتایا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ جب قائداعظم 14 اگست کو کراچی میں آزادی کی تقریبات میں شرکت کرنے تشریف لائیں تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائے یہ سب کچھ سننے کے باجود قائدعظم کے اطمینان میں فرق نہ آیا اور فرمایا۔ یوم آزادی کا جلوس پروگرام کے مطابق نکلے گا۔ کیونکہ یہ تقریب سب سے اہم اور مبارک ہے۔

14 اگست 1947ء بروز جمعرات ماونٹ بیٹن کے ساتھ قائداعظم کھلی بگھی

میں گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہوئے۔ جہاں اقتدار کی منتقلی کی رسومات ادا ہوئیں۔ راستہ میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ جب بگھی گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوئی تو قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ خدا کا شکر ہے آپ میرے ساتھ زندہ سلامت واپس آ گئے۔

بحیثیت سربراہ مملکت

15 اگست 1947 کو گزٹ آف پاکستان کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس میں قائداعظم کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اختیارات سنبھالنے کا باضابطہ اعلان درج تھا۔ اسی گزٹ میں ایک اور اطلاع یہ بھی تھی کہ ہزایکسیلنسی گورنر جنرل نے مسٹر لیاقت علی خان، مسٹر آئی آئی چندریگر، مسٹر غلام محمد، سردار عبدالرب نشتر، مسٹر غضنفر علی خان، مسٹر جوگندر ناتھ منڈل اور مسٹر فضل الرحمٰن کو وزیر مقرر کیا ہے۔

پاکستان ایک غیر معمولی سیاسی بحران میں وجود میں آیا تھا۔ اور وجود میں آنے کی گھڑی ہی سے شدید تر مسائل اور مشکلات کے بھنور میں گھرا ہوا تھا۔ ایک عظیم مملکت کی انتظامیہ کو تقریباً مکمل بے سروسامانی کی حالت سے بروئے کار لانا ہی کچھ کم مسئلہ نہ تھا ملک میں لاکھوں لٹے پٹے تباہ حال مہاجر آنے لگے۔ ریڈکلف ایوارڈ کی صریح ناانصافی سب کے لیے ایک زبردست نفسیاتی صدمہ تھی جس نے

کشمیر کا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ ملک کے حصے کا فوجی ساز وسامان اور روپیہ ابھی تک ہندوستان میں ہی تھا۔ ان حالات میں قائداعظم نے ملک کی سربراہی کے اختیارات سنبھالے۔

اس وقت قائداعظم کی عمر ستر سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ قرارداد لاہور سے وہ مسلسل تگ و دو میں مصروف تھے اور اب پاکستان بننے پر سنگین تر مسائل کا سامنا تھا۔ لیکن قائداعظم تو قائداعظم تھے۔ انہوں نے اس مرحلے میں قوم کو منظم کیا۔ حوصلوں کو بلند کیا۔ سیاسی راہ نمائی کی اور مشکلات و مسائل سے عہد برآ ہونا سکھایا۔

قائداعظم کی نظر مملکت کے بڑے سے بڑے امور سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی جزئیات تک رہتی تھی۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری ایس ایم یوسف نے لکھا ہے۔

> ''قائداعظم اصولی طور پر اس وقت تک کسی مسودہ قانون پر دستخط نہیں کرتے تھے جب تک وہ اس کے ہر لفظ ہر سطر سے خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ وہ انتظامیہ کو چوکس رکھتے تھے اور کسی کو اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ علالت، خرابی صحت یا کوئی اور رکاوٹ انہیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔''

اگرچہ قائداعظم کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی تاہم ان کی خواہش تھی کہ

مہاجر کیمپوں کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے خود لاہور جائیں۔

انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتیں جو انہیں تمام چیزوں سے زیادہ عزیز تھا یا اپنی صحت کی فکر کریں انہوں نے ڈاکٹروں کا مشورہ نظر انداز کر دیا اور فرض کو ادا کرنے کا فیصلہ کیا اُنہوں نے فرد کی حیثیت سے اپنے تمام حقوق قوم کے سپرد کر دیئے تھے۔ ستمبر 1947ء میں وہ کراچی سے لاہور روانہ ہوئے ڈاکٹروں نے صرف چند لوگوں سے ملنے اور روزانہ ایک گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ لاہور میں حیدر آباد کے سلسلہ میں انہوں نے گھنٹوں گفتگو کی۔ کشمیر کے مسئلہ پر غور کیا۔ کیمپوں کو دیکھا۔ سیاسی گتھیاں سلجھائیں نیتجتاً انہیں حرارت ہوگئی۔ چند دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد کراچی واپس آ گئے۔ لیکن اہم سیاسی اور ملکی مسائل کو حل کرنے اکتوبر کے آخر میں دوبارہ لاہور تشریف لے گئے۔ 30 اکتوبر 1947ء کو انہوں نے یونیورسٹی اسٹیڈیم لاہور میں بہت بڑے اجتماع کے سامنے زبردست تقریر کی۔

اس تقریر میں پاکستان کو درپیش مسائل کا جائزہ لینے کے بعد کہا:

''اگر ہم قرآن پاک کو راہ نما بنائیں تو یقیناً فتح ہماری ہوگی۔''

قائداعظم جس وقت تقریر کر رہے تھے شدت جذبات سے ان کی زبان سے پورے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے کسی جلسۂ عام میں موت کا ذکر کیا۔ انہوں نے فرمایا:

''اپنا حوصلہ بلند رکھیئے۔ موت سے خوفزدہ نہ ہوں ہمارے
مذہب نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم سفر آخرت کے لیے ہر وقت تیار
رہیں۔ ہمیں حوصلے اور جرأت کے ساتھ موت کا سامنا کرنا
چاہیے۔ تاکہ پاکستان اور اسلام کے ناموس کی حفاظت کی جا
سکے۔ مسلمان کے لیے شہادت سے بڑھ کر کوئی رتبہ نہیں۔ اپنا
فرض انجام دیجئے اور خدا پر کامل اعتماد رکھیئے دنیا کی کوئی طاقت
پاکستان کا وجود ختم نہیں کر سکتی۔ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا۔''

اس سفر سے انہیں بڑی تکلیف پہنچی کچھ مہاجروں کی حالت زار کا بھی اثر تھا۔ علالت عود کر آئی۔ اور انہیں پھر مجبوراً ڈاکٹروں کے اصرار پر کچھ عرصے کے لیے تھوڑا آرام کرنا پڑا۔ مارچ 1948ء میں وہ مشرقی پاکستان گئے وہاں انہوں نے صوبائیت کے زہر سے بچنے کی تلقین کی اور کہا کہ پاکستان کی زبان اردو ہو گی۔ اپریل 1948ء میں پشاور گئے یہاں انہوں نے طلباء سے خطاب کیا۔ حصول پاکستان کے لیے ان کی خدمات کو سراہا۔ رسالپور میں انہوں نے ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کیا 14 اپریل کو گورنمنٹ ہاؤس میں سول افسروں سے طویل گفتگو کی اور آخر میں ایک جلسہ عام سے تقریر کی اور بہادر پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا تھا اس دورے میں قائداعظم ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی

دیکھتے بوندا باندی ہونے لگی۔ بارش تیز ہوگئی مگر حاضرین میں سے ایک شخص نے اپنی جگہ سے جُنبش نہیں کی۔ خود قائداعظم بھی شرابور ہو گئے تھے لیکن اپنی نشست سے نہ ہلے۔ تکان اور کثرت کار کے سبب قائداعظم بھی علیل ہو گئے۔

زندگی کی شام

آخری علالت

بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جنہیں حالات بڑا بنا دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کی شخصیت ہی بڑی ہوتی ہے۔وہ اپنی بڑائی کے لیے کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔وہ ہر حال میں بڑے رہتے ہیں۔ بلکہ نا مساعد حالات میں ان کے جوہر زیادہ کھلتے ہیں۔ قائداعظم اسی قسم کے بڑے آدمی تھے۔ طویل مہلک علالت بڑے بڑوں کو معذور اور مجبور کر دیتی ہے۔موت کے سائے بڑے بڑے دِلاوروں اور حوصلہ مندوں کا پتہ پانی کر دیتے ہیں۔ قائداعظم وہ عظیم انسان تھے جنہیں نہ طویل مہلک بیماری زیر کر سکی نہ موت کے بڑھتے ہوئے سائے انہیں بے چین اور خوفزدہ کر سکے۔ ایک مصنف نے لکھا ہے کہ بعض بڑے آدمیوں کی زندگی

میں بڑائی کا ایک دن آتا ہے اس دن کے ڈھلنے کے بعد ان کی باقی زندگی اس بڑائی کی نفی میں گزرتی ہے۔

قائداعظم کی ساری زندگی بڑائی کا طویل دن تھی اور ان کی موت بھی کچھ کم پروقار اور کم موثر نہیں تھی۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ہر فانی جسم کو فنا ہونا ہے۔ ان کا جسم مدتوں طوفانوں اور آندھیوں کا مقابلہ کرنے کے بعد بالا آخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا تھا ان کی جسمانی قوتیں انجام کار جواب دینے لگی تھیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا جمال و جلال ان کے کردار کا وقار اسی طرح قائم رہا۔ جس موت سے ہمکنار ہوئے تو وہی لفظ ان کی زبان پر تھا۔ (بقول ڈاکٹر ریاض علی شاہ جو ان کے انتقال کے وقت ان کے پاس موجود تھے) ''اللہ پاکستان'' وہ آخری دو الفاظ تھے جو قائداعظم کے منہ سے نکلے۔

(قائداعظم کے آخری لمحات صفحہ نمبر 97)

قائداعظم کی صلاحیتیں بھی غیر معمولی تھیں لیکن غیر معمولی تر، ان کی مسلسل محنت اور مشقت کی عادت تھی۔ بقول خود وہ مسلسل چودہ گھنٹے روز کام کرتے رہے۔ قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد سے ان کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ ضروری آرام کرنے پر یا کام کو کم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ وہ غیر معمولی قوت ارادی سے کام کیے جا رہے تھے۔ لیکن جسم کو گھن لگ چکا تھا۔

1945ء میں پھیپھڑوں میں خرابی کا شبہ ہوا لیکن حسبِ عادت انہوں نے بیماری پر توجہ نہ دی اور محض معمولی تکلیف سمجھ کر ٹال دیا۔ اہم سیاسی مذاکرات جاری تھے۔ شملہ کانفرنس، کابینہ مشن کے مذاکرات، انتہائی اہمیت کے انتخابات، وہ ان انتہائی اہم معاملات میں اس طرح مصروف رہے کہ جسم کو آرام اور علاج کا وہ حصہ نہیں دے سکے جس کا وہ مستحق تھا۔ ان ہی ہنگاموں میں پاکستان کی منزل قریب آرہی تھی ایک نئی مملکت ان کے ہاتھوں جنم لے رہی تھی۔ اور خود ان کی اپنی زندگی آخری مراحل میں داخل ہو رہی تھی شروع اگست میں کراچی پرواز کرنے سے پہلے انہیں ان سازشوں کا علم بھی ہو گیا تھا جو ان کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ لیکن خوف کھانا تو وہ جیسے جانتے ہی نہ تھے۔

14 اگست کو سربراہ مملکت کا منصب سنبھالتے ہی نئی مملکت کو انتہائی نا مساعد حالات میں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کا بار بھی انہیں ہی اٹھانا تھا بھارت میں مسلمانوں کے قتل عام اور مہاجرین کی یلغار اور بربادی سے انہیں شدید جذباتی صدمے پہنچے۔ باونڈری کمیشن کی غداری، کشمیر کی جنگ اور اس کے بعد کے الجھاؤ نے قائداعظم کی صحت کو شدت سے متاثر کیا۔ اب ستر سال سے اوپر کے ہو چکے تھے۔ توانائی کم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن محنت و مشقت کے بار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹروں کے بار بار کے مشورے کے باوجود وہ منصبی کام میں مصروف تھے اور قریبی دائرے کے لوگوں کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اندر سے ان کی صحت

کس حد تک گر چکی ہے۔

مئی 1948ء میں انہیں پاکستان ملٹری اکیڈمی کے افتتاح کے لیے کاکول جانا تھا۔ افواج پاکستان کی تربیت و ترقی سے جو انہیں گہری دلچسپی تھی اس کے پیش نظر وہ وہاں جانے کے لیے مصر تھے لیکن طبیعت کے یکا یک زیادہ خراب ہونے کی وجہ سے وہ نہیں جا سکے۔ اور ڈاکٹروں کے بے حد اصرار پر مجبور ہو کر وہ مئی 1948ء کے اواخر میں کوئٹہ تشریف لے گئے آرام اور علاج سے انہیں کچھ افاقہ بھی ہوا۔ 30 جون 1948ء کو اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے لیے انہیں کراچی واپس آنا پڑا انہوں نے پورے اہتمام سے تقریب میں حصہ لیا۔ اپنے مخصوص انداز اور لب و لہجے میں افتتاحی تقریر بھی کی۔ لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سورج کو گہن لگنے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔ چٹان میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔ لیکن ان کے جلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کراچی کے مختصر قیام کے دوران اُنہوں نے بقول پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کے، اتنا کام کیا کہ کوئٹہ میں چند ہفتے آرام اور علاج سے جو صحت بحال ہوئی تھی۔ وہ زائل ہو گئی اور جب وہ واپس کوئٹہ پہنچے تو پہلے سے زیادہ علیل اور کمزور ہو چکے تھے۔

کوئٹہ اور زیارت میں جو علاج ممکن تھا وہ ہو رہا تھا چوں کہ وہ اپنی علالت کو ہمیشہ کی طرح زیادہ اہمیت نہیں دے تھے ان کا خیال تھا کہ انہیں کچھ معدے کی تکلیف ہے کچھ کام کی زیادتی کی وجہ سے تھکن ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی جیسا کہ

بعد میں ماہر معالجوں نے ایکسرے اور دوسرے معائنوں سے تصدیق کی کہ تقریباً دو سال سے ان کے پھیپھڑے متاثر تھے جولائی 1948ء کے تیسرے ہفتے میں جب ان کی حالت بگڑنے لگی تو مس جناح نے سیکریٹری جنرل چودھری محمد علی کے توسل سے مشہور ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو زیارت طلب کیا چند روز بعد ڈاکٹر ریاض علی شاہ بھی بلا لیے گئے۔ جولائی کے چوتھے ہفتے سے قائداعظم کی وفات تک یہ دونوں قابل ڈاکٹران کے علاج معالجے کے لیے حاضر رہے۔ انہوں نے قائداعظم کو پہلے بھی دیکھا تھا۔ سنا بھی تھا اب شب و روز معالجوں کی حیثیت سے انہیں بستر علالت پر دیکھا۔ ان سے باتیں کیں۔ طبی مشورے دیئے دوائیں تجویز کیں۔ پرہیز کرایا۔ تکلیف دہ انجکشن لگائے۔ ان کی حالت کو بہتر ہوتے اور بگڑتے دیکھا۔

غرض چھ سات ہفتے وہ مس جناح اور پرائیویٹ سیکرٹری فرخ امین کے ساتھ قائداعظم کی خلوت و جلوت کے ساتھی رہے۔ قائداعظم کی وفات کے بعد ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے اپنے مشاہدات ''قائداعظم کے آخری ایام'' کے نام سے لکھے۔ ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے اپنے تاثرات ''قائداعظم کے آخری لمحات'' کے عنوان سے قلم بند کیے اور قائداعظم کے سیکرٹری فرخ امین نے اپنے تجربات ''حیاتِ قائد کا آخری سال'' کے عنوان سے شائع کیے۔

ان تینوں تحریروں سے قائداعظم کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ کسی فرشتے، دیوتا کی تصویر نہیں ایک انسان کی تصویر ہے جو بیماری میں ضد بھی کرتا ہے دوا سے بچتا بھی

ہے۔ بد پرہیزی بھی کرتا ہے لیکن جو بیماری میں بھی عظیم ہے جو با اصول ہے، باوقار ہے جو دلیل سے معالجوں کی ناگوار باتیں قبول کر لیتا ہے جو باہمت' باحوصلہ ہے جو موت سے نہیں ڈرتا جس کی دیانت وضع داری کوئی استثنائی صورت قبول کرنے پر تیار نہیں جو موت کو روبرو دیکھتے ہوئے بھی ہراساں نہیں ہوتا۔ جو آخری دم تک اپنے فرائض منصبی میں منہمک رہتا ہے. جس کے شعور ہی میں نہیں بلکہ لاشعور میں بھی ایک ہی دھن ہے ''پاکستان'' قائداعظم کی کوئی داستان مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ان کی زندگی کے آخری ایام کا قدرے تفصیلی جائزہ بلکہ مطالعہ نہ پیش کیا جائے اس لیے قائداعظم کے کردار اور شخصیت کی عظمت کا صحیح اندازہ ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ انہیں اپنی زندگی کی آخری لڑائی لڑتے ہوئے نہ دیکھا جائے۔

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش جولائی 1948ء کے آخری ہفتے میں زیارت پہنچے۔ انہیں قائداعظم کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر لاہور سے بلوایا گیا تھا شام کو ان کے آنے کی اطلاع قائداعظم کو کرائی گئی۔ لیکن قائداعظم نے ملاقات کا وقت دوسرے روز صبح مقرر کیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش کو حیرت تو ہوئی کہ بیماری کی اس حالت میں بھی یہ تکلف برتا جا رہا ہے لیکن اس میں حیرت والی بات نہیں اس وقت تک بیماری قابو سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اور قائداعظم کا خیال تھا کہ کچھ معدے کی خرابی اور کچھ کام کی زیادتی سے وہ تھکن اور کمزوری کا شکار ہو گئے ہیں۔ دوسرے روز مقررہ وقت پر انہوں نے ایک اچھے مریض کی طرح کرنل الٰہی بخش کو اپنی گذشتہ تکلیفوں

سے آگاہ کیا انہوں نے کہا:

''چند برس پہلے کبھی کبھی بخار اور کھانسی کی تکلیف ہو جایا کرتی تھی ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ پھیپھڑوں میں کچھ خرابی ہے تقریباً دو سال سے پھر یہ تکلیف عود کر آئی مجھے ڈاکٹروں سے اتفاق نہیں 1934ء میں بمبئی کے ڈاکٹروں نے مجھے دل کی تکلیف بتا دی تھی۔ ایک بار لندن کے ڈاکٹروں نے معدے کی تکلیف کے لیے آپریشن تجویز کر دیا تھا۔ دونوں بار جرمنی جا کر صحیح تشخیص ہوئی تھی کہ معدے کی کمزوری اور تھکان نے طبیعت کو مکدر کر دیا تھا۔ اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ معدے میں کچھ خرابی ہے۔ میں گذشتہ چالیس سال سے چودہ گھنٹے کام کرتا رہا ہوں کبھی کبھی کام کی زیادتی سے اعصابی تھکن کا شکار ہو ہی جایا کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر الٰہی بخش نے پھر بھی تفصیلی معائنے کی اجازت چاہی۔ انہیں بتا دیا گیا تھا کہ ماضی میں ڈاکٹروں کے متضاد مشوروں سے انہیں ڈاکٹروں پر اعتماد کم ہے۔ دواؤں سے بیزار ہیں ڈاکٹر الٰہی بخش لکھتے ہیں:

''معائنے کے بعد میں حیران ہوا کہ اتنے دبلے اور ناتواں ہو کر وہ زندہ کیسے ہیں اور اتنا کام کیوں کر کر لیتے ہیں۔''

تفصیلی معائنے کے بعد ان کی رائے یہ تھی کہ اصل تکلیف معدے کی نہیں پھیپھڑوں کی ہے جس کی تصدیق ایکسرے اور دوسرے لیبارٹری تجربوں سے بھی ہوئی اب مسئلہ یہ تھا کہ علاج میں ان کا تعاون حاصل ہو ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی تھا کہ مرض کی نوعیت سے ان کے دل و دماغ پر ناگوار اثر نہ پڑے اور علاج مزید دشوار نہ ہو جائے ڈاکٹر الٰہی بخش یہ خبر قائداعظم کو سنانے سے ہچکچا رہے تھے۔ لیکن مس فاطمہ جناح اپنے عظیم بھائی کو زیادہ جانتی تھیں۔ انہوں نے کہا:

''میرے بھائی کو اس چیز کی گھبراہٹ نہیں ہوگی۔ آپ ضرور بتائیے ان کے تعاون کے بغیر علاج ممکن نہیں۔''

(مس فاطمہ جناح، قائداعظم کو''میرا بھائی یا مائی بردار'' کہا کرتی تھیں)

مس جناح کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ قائداعظم نے مرض کی اس سنگین نوعیت کے بارے میں یہ اطلاع بڑے سکون اور وقار سے سنی۔ آخر میں اتنا پوچھا فاطمہ کو تو نہیں بتایا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے اعتراف کیا کہ وہ ضرور بتا چکے ہیں طبی اخلاقیات کی رو سے اس صورت حال میں ان کے قریب ترین عزیزوں میں سے کسی کو اعتماد میں لینا ضروری تھا اور چوں کہ مس فاطمہ جناح کے علاوہ کوئی اور موجود نہ تھا اس لیے مجبوراً انہیں صورت حال سے آگاہ کرنا پڑا۔

یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا:

''فاطمہ کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ آخر وہ عورت ہی تو ہیں۔''

جری اور حقیقت پسند

قائداعظم نے زندگی بھر اپنے عظیم مقصد کی خاطر جرات اور حقیقت پسندی سے جدوجہد کی تھی۔ اب جب کہ ان کی زندگی طوفان کی زد میں تھی۔ اس وقت بھی انہوں نے اپنی روایتی جرأت اور حقیقت پسندی سے کام لیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش سے کہا پوری بات بتائیے۔ مرض کی پوری نوعیت سے آگاہ کیجیے۔ امکانات کیا ہیں علاج کی کیا تدبیر اختیار کی جائیں۔ مکمل صحت یابی میں کتنا عرصہ لگے گا۔ حسبِ عادت وہ اس مشکل صورت حال سے ہراساں ہونے کے بجائے اس سے ہوش و حوصلے سے نپٹنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان کے اس ردِعمل سے ڈاکٹر کو حیرت ہوئی اور اطمینان بھی چوں کہ ان کے اس ذہنی رویے سے علاج کے زیادہ موثر ہونے کا امکان تھا۔

نرس کی ضرورت نہیں

ڈاکٹر الٰہی بخش نے علاج کو زیادہ منظم کرنے کے لیے ایک نرس کو مقرر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ قائداعظم نے اتفاق نہیں کیا اصل میں وہ اپنے آپ کو اتنا بیمار نہیں سمجھتے تھے کہ ایک نرس کے محتاج ہوں محتاجی انہیں کسی صورت میں گوارا نہیں تھی۔ یہ ان کے کردار کی ایک مستقل خصوصیت تھی جو ہر حال میں اور ہر دور میں باقی رہی۔

اصول پرستی کی قدر

نرس کے تقرر پر وہ راضی نہ ہوئے تھے لیکن ٹمپریچر وغیرہ لینے اور دوا پیش کرنے کی خدمت پر وہ ایک لیڈی کمپاؤنڈر مقرر کرنے پر راضی ہوگئے ایک بار قائداعظم نے اس سے اپنا ٹمپریچر پوچھا اس فرض شناس لیڈی کمپاؤنڈر نے یہ کہہ کر معذرت کی میں ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر آپ کو ٹمپریچر نہیں بتا سکتی اس کے با اصول انکار پر قائداعظم ناراض ہونے کی بجائے خوش ہوئے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ وہ خود با اصول اور ڈسپلن کے پابند انسان تھے اور جو باقاعدگی اور ڈسپلن سے کام کرے اس کی تعریف اور قدر کرتے تھے۔

ضرورت کے بغیر خرچ نہیں

زیارت کی بڑھتی ہوئی ٹھنڈک میں قائداعظم کے ریشمی شب خوابی کے کپڑے ناکافی تھے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے گرم پاجامہ پہننے کا مشورہ دیا قائداعظم نے کہا:

''میرے پاس گرم پاجامے نہیں ہیں کیوں نہ گاڑھے کے بنائے جائیں۔''

ڈاکٹر نے کہا:

سوتی مناسب نہیں رہیں گے اس لیے میں نے خود ہی کراچی سے بیس گز

وائلا منگوانے کا اہتمام کیا ہے قائداعظم نے فرمایا:

''ڈاکٹر سنیے میری نصیحت یہ ہے کہ جب آپ کچھ خریدنا چاہیں تو دوبارہ غور کرلیا کریں کیا اس کے بغیر کام چل سکتا ہے یا واقعی اس کی ضرورت ہے۔''

قائداعظم کسی چیز کو بے جا صرف کرنے کے قائل نہ تھے خواہ وہ پیسہ ہو، وقت ہو یا توانائی اسی احتیاط یا اعتدال کی وجہ سے وہ زندگی میں اتنے بڑے کام کر سکے۔ جب ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے اصرار کیا کہ واقعی گرم کپڑے کی ضرورت تھی تو مسکرا کر فرمایا اچھا تو ٹھیک ہے ان کی افتادِ طبع ہی ایسی تھی کہ وہ بے دلیل کوئی بات نہیں مانتے تھے۔ دلیل سے وہ بات بھی قبول کر لیتے تھے جو انہیں طبعاً مرغوب نہ ہو۔ یا جسے وہ عادتاً پسند نہ کرتے ہوں۔ مثلاً نرس سے دیکھ بھال کرانا انہیں پسند نہ تھا لیکن جب ڈاکٹر نے اس کی ضرورت پر زور دیا تو انہوں نے اسے بھی قبول کرلیا۔

وضع داری کا پاس

11 اگست 1947ء سے ان کی حالت پھر بگڑنے لگی تھی پاؤں میں ورم آ گیا تھا اور گردے متاثر ہونے لگے تھے اس لیے انہیں زیارت سے کوئٹہ لے جانا ضروری سمجھا گیا۔ 13 اگست کو روانگی تھی ان کی حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ وہ کپڑے نہ بدلیں اور سفر کا کوئی اہتمام نہ کریں لیکن اتنی نقاہت کے

باوجود انہوں نے شلوار اور شیروانی پہننے پر اصرار کیا۔ اور پورے رسمی لباس میں سفر کیا حالانکہ اسٹریچر پر اوپر سے نیچے لاکر موٹر میں لٹائے گئے تھے راستے میں گیسٹ ہاؤس میں انہیں چائے پینے کے لیے ٹھہرنا تھا لیکن وہاں لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے سفر جاری رکھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ اس حالت میں انہیں چائے پیتے دیکھیں اور یہ بھی گوارا نہ تھا کہ محض اس لیے لوگوں کو وہاں سے ہٹوا دیں۔ کوئٹہ پہنچ کر انہوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور کہا آپ لوگوں نے بہت اچھا کیا مجھے یہاں لے آئے زیارت میں مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں پنجرے میں بند ہوں۔

پسندیدہ ڈش

کوئٹہ آنے سے قائداعظم کو خاصا افاقہ ہوا۔ بخار اتر گیا اور کچھ بھوک بھی لگنے لگی۔ اخبارات اور ضروری کاغذات دیکھنے لگے۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اپنی پسندیدہ ڈش حلوہ کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر نے اجازت دی بشرطیکہ کہ حلوے کو ہلکا کر کے مکھن میں بنایا جائے۔

بدپرہیزی

لیکن وہ حلوے کو پوری کے ساتھ کھانا چاہتے تھے ڈاکٹر نے کہا پوری بھاری ہوتی ہے اس لیے معدے پر بار پڑے گا۔ انہوں نے کہا میں خاص قسم کی

پوری کھاتا ہوں۔ڈاکٹر پھر بھی نہ مانے۔دوسرے روز ڈاکٹر کو پتا چلا کہ انہوں نے رات کو حلوے کے ساتھ ایک آدھ پوری بھی کھالی تھی۔بہرحال حلوہ پوری سے انہیں کوئی تکلیف نہ ہوئی۔اب ان کی حالت قدرے بہتر تھی۔تجویز ہوئی بستر سے دو چار قدم چلنا شروع کریں 24 اگست کو چہل قدمی کی کوشش کا وقت 8 بجے مقرر ہوا تھا ڈاکٹر الٰہی بخش ذرا دیر سے پہنچے۔قائداعظم نے باز پرس کی۔

''میں نے آپ کو آٹھ بجے آنے کے لیے کہا تھا میں اپنے معالجوں سے پابندی وقت کی توقع رکھتا ہوں''

بعد کو فاطمہ جناح نے اس واقعہ پر کہا:

''میرے بھائی کی نظر میں پابندی وقت کی بڑی اہمیت ہے وہ خود اس اصول پر ہمیشہ سے کاربند رہے ہیں۔''

ڈاکٹر ان کی ظاہری بحالی سے غالباً ضرورت سے زیادہ پرامید تھے۔وہ ان کو چہل قدمی کرنے اور کراچی لے چلنے میں قدرے جلد بازی اور بے صبری سے کام لے رہے تھے۔لیکن خود قائداعظم اپنے اندرونی احساس کی بناء پر اپنے آپ کو اس مشقت کے لیے آمادہ نہیں پاتے تھے۔

خوش مزاجی کا مظاہرہ

ڈاکٹر یوں باز نہ آئے تو انہوں نے مزاحیہ انداز سے سمجھانے کی کوشش

کی۔انہوں نے ایک بوڑھی عورت کی کہانی بیان کی جو صحت مند ہونے کے بعد بھی اور ڈاکٹروں کے بار بار کہنے سے بھی بستر سے نہیں اٹھتی تھی۔آخر کار ایک نئے ڈاکٹر نے جان بوجھ کر اس کے بستر آگ کو لگا دی آگ کو دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ کر بھاگی اور بھاگتی ہی چلی گئی۔ یہ کہانی سنانے کے بعد انہوں نے اپنے معالجوں کو مسکرا کر دیکھا اور کہا مجھے توقع ہے آپ میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کریں گے پھر شفقت سے سمجھانے لگے۔بستر سے اٹھنے چلنے پھرنے کا خواہش مند میں بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن فی الحال میں اپنے میں وہ سکت نہیں پاتا۔

کل 80 پونڈ وزن

کرنل الٰہی بخش نے لکھا ہے صحت کی بحالی کے بعد بھی ان کا وزن 80 پونڈ تھا۔زیارت میں اس سے بھی کم ہوگا۔قائداعظم نے انہیں بتایا بہت اچھی صحت کے زمانے میں بھی ان کا وزن 8 سٹون 100 پونڈ سے زیادہ کبھی نہ ہوتا تھا۔

پسندیدہ سگریٹ

کریون اے ان کا پسندیدہ سگریٹ تھا جب انہیں سگریٹ پینے کی اجازت ملی تو انہوں نے کریون اے طلب کیا اس کی عدم موجودگی میں اسٹیٹ ایکسپریس 555 بھی استعمال کیا لیکن جب کریون اے ملا تو ایک کے بجائے رات کو

مزے سے چار بھی پیئے۔ ڈاکٹر نے ایش ٹرے میں جب چار سگرٹوں کے ٹکڑے دیکھے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ان کے پسندیدہ کھانوں اور سیگرٹوں کی خواہش سے ڈاکٹر خوش تھے کہ وہ اپنی صحت کی زندگی کی عادات کی طرف واپس لوٹ رہے ہیں۔ لیکن قائداعظم تو ہر حالت میں قائداعظم رہتے تھے۔ کریون اے کے پسندیدہ سگرٹوں کا کرنل الٰہی بخش کا پیش کیا ہوا ڈبہ انہوں نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ سگریٹ پرانے ہوگئے ہیں۔ اصل میں وہ ڈاکٹر الٰہی بخش کا احسان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

بلا قیمت کوئی چیز نہیں

قائداعظم کا ایک نا قابل شکست اصول یہ تھا کہ بلا قیمت کسی سے کوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ کرنل الٰہی بخش کا پیش کیا ہوا پسندیدہ نایاب سگرٹوں کا ڈبہ انہوں نے اسی اصول کی وجہ سے واپس کیا۔ کرنل الٰہی بخش نے اپنی کتاب میں دو ایسے واقعے اور بھی لکھے ہیں۔

شروع تاریخوں میں کوئٹہ کے جی او سی میجر جنرل محمد اکبر کی بیگم نے ڈاکٹر الٰہی بخش کے ہاتھ قائداعظم کے لیے کچھ اعلیٰ قسم کے انگور بھیجے۔ قائداعظم کو یہ انگور بہت پسند آئے اور بہت رغبت سے کھائے پوچھا ایسے اچھے انگور آپ کو کہاں سے مل گئے انہوں نے عرض کیا بیگم جنرل اکبر خان نے بھیجے ہیں ساتھ ہی یہ بھی کہا اگر آپ

پسند فرمائیں تو وہ ہر روز اسی قسم کے انگور بھجوا سکتی ہیں۔ قائداعظم نے بیگم اکبر خان کا شکریہ ادا کیا اور مزید انگور قبول کرنے سے معذرت کی۔

ایک بار جنرل اکبر خان نے ڈاکٹر الٰہی بخش کے ہاتھ نادر سبز گلاب قائداعظم کو بھیجے اور کہا اگر قائداعظم کو یہ گلاب پسند آئے تو ہر روز یہاں سے تازہ سبز گلاب بھیجے جا سکتے ہیں۔

قائداعظم نے گلاب بہت پسند کیے۔ شکریہ کے ساتھ سبز گلابوں کا یہ تحفہ بھی قبول کیا۔ لیکن فرمایا:

''میں جنرل کو پھول بھیجنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔''

جلد کراچی واپس جانے سے گریز

اگست کے تیسرے ہفتے سے کوئٹے کی آب و ہوا بھی ان کے لیے شدید ثابت ہو رہی تھی۔ اور صحت کی بحالی ایک دم ابتری سے بدلنے لگی تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا اب کراچی چلنا مناسب رہے گا۔ لیکن وہ کراچی جانے کو ٹالتے رہے ادھر ڈاکٹرں کا اصرار بڑھتا رہا۔ آخر انہیں صاف بتانا پڑا کہ ایک بے دست و پا مریض کی حیثیت سے مجھے کراچی جانے کے خیال سے وحشت ہوتی ہے۔ مس جناح نے بھی کہا کہ بھائی کو بیماری کی حالت میں گورنر جنرل ہاؤس واپس نہیں جانا چاہیے۔

بے لچک اصول پرستی

آخر کار ایک متبادل انتظام کے طور پر وہ اور ڈاکٹر ملیر منتقل ہونے پر متفق ہو گئے اب ایک اور دشواری پیش آئی۔ملیر میں قائداعظم کے قیام کے لیے جو مکان موزوں تھا وہ نواب صاحب بہاولپور کی ملکیت تھا اور وہ بحیثیت گورنر جنرل نہیں چاہتے تھے کہ مکان کے لیےنواب صاحب سے درخواست کریں۔

کم کھانے کی عادت

اگست کے اواخر میں یکا یک ان کی غذا پھر کم ہوگئی۔توانائی کو قائم رکھنے کا سہارا نہ رہا۔ڈاکٹر پریشان ہوکر ان سے بار بار کچھ نہ کچھ کھانے کی درخواست کرنے لگے۔اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا:

''ڈاکٹر! میں نے اچھی حالت میں بھی کبھی اتنا نہیں کھایا۔ جتنا آپ کھلانا چاہتے ہیں۔کیا آپ نہیں سمجھتے کہ زیادہ کھانا مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے؟''

اگست کے آخری دنوں میں وہ بہت اداس اور محزون نظر آنے لگے تھے۔ علاج اور کھانے ہی میں نہیں سب چیزوں میں ان کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی۔ان کی افسردگی کو دیکھ کر ڈاکٹر الہٰی بخش نے کہا:

''سر! آپ جس ریاست کو وجود میں لائے ہیں اسے پوری طرح مستحکم اور استوار ہونے کے لیے ابھی سالہا سال تک آپ کی ضرورت ہے۔''

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا:

''میں اپنا کام پورا کر چکا ہوں اب میرا مرنا جینا برابر ہے۔''

اور نڈھال ہوکر خاموش ہو گئے۔

قوت ارادی سے زندہ

وہ ایک عرصے سے اس مہلک مرض کی گرفت میں تھے لیکن پاکستان کو منزل مراد تک پہنچانے کی خاطر زندہ رہنے کی شدید خواہش اور ارادے نے ساتھ چھوڑا تو فانی جسم بکھرنے لگا۔ لیکن یہ ان کی ہار نہیں جیت تھی۔ وہ ایک مقصد کی خاطر زندہ تھے اس کے حصول کے بعد محض زندہ رہنے میں ان کی عظمت کا ایک انوکھا پہلو تھا۔ 5 ستمبر 1948ء کو نمونیے کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

وہ ٹیکوں سے گھبراتے تھے لیکن ڈاکٹروں کے اصرار پر ایک اچھے مریض کی طرح انہوں نے تکلیف دہ ٹیکے بھی لگوائے۔ لیکن بات نہ بنی 6 ستمبر کی صبح سے سانس لینے میں گھٹن کم کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکیاں کھلوا دیں اور میز کا پنکھا لگوا دیا بعد کو آکسیجن دینے سے کچھ تکلیف میں کمی ہوئی۔ 9 ستمبر کو ریڈیو سے خبریں

سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کشمیر کے مسئلے سے دلچسپی

وہ چند دنوں سے خاص طور سے کشمیر کے خیال میں غلطان و پیچاں تھے ایک بار تیز بخار اور بے چینی کے عالم میں، مس جناح نے انہیں اس مسئلے کے متعلق بڑبڑاتے سنا۔ایک بار نیم بے ہوشی کی حالت میں وہ یہ کہتے سنے گئے۔

"کشمیر کمیشن کو آج مجھ سے ملنا تھا وہ اب تک کیوں نہیں آئے کہاں چلے گئے۔"

کشمیر ان کے لاشعوری ذہن میں رچا ہوا تھا۔وہ آخری سرکاری کاغذات، جن پر انہوں نے بصد مشکل اپنے دستخط ثبت کیے اقوام متحدہ میں پاکستانی نمائندے کے اختیارات کے بارے میں تھے۔

غروبِ آفتاب

اصل میں اب سورج ڈوبنے لگا تھا۔کشتی کے لنگر ٹوٹنے لگے تھے۔ ڈاکٹروں نے مس فاطمہ جناح کو صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔انہیں خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے عظیم بھائی نے جسم کی فانی سرحدوں سے رُوح کے لافانی ساحلوں کی طرف سفر شروع کر دیا ہے۔

اصول اور قوت ارادی کا معجزہ

11 ستمبر 1948ء کی دوپہر کو جب قائد اعظمؒ کو اسٹریچر پر لٹا کر ہوائی اڈے کی طرف پہنچایا جا رہا تھا تو جہاز کے ہوابازوں نے انہیں سلامی دی۔ کرنل الٰہی بخش لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ انہوں نے اس کا بڑا چستی سے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ نقاہت کے مارے ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ بستر پر کروٹ لینے میں بھی دقت محسوس ہوتی تھی۔ اور کوشش کے بغیر کھانس بھی نہیں سکتے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ اس ناتوانائی میں سلامی کا اس سرگرمی سے جواب دینے کی طاقت ان میں کہاں سے آئی۔ ان کے ہاتھوں کی اس یادگار جنبش سے جھلکتا تھا کہ بستر مرگ پر بھی وہ ضبط و نظم کے تقاضے سے غافل نہیں تھے۔''

جہاز میں انہیں آکسیجن دی جاتی رہی۔ سوا چار بجے گورنر جنرل کا خاص جہاز ماڑی پور کے اڈے پر اترا۔ ایمبولینس چار میل کے بعد خراب ہو گئی۔ دو گھنٹے کے بعد دوسری گاڑی آئی۔ شام تک گورنر جنرل ہاؤس کا مختصر راستہ طے ہوا۔ اس تکلیف دہ سفر کو قائد اعظم نے برداشت کر لیا لیکن سوا نو بجے حالت بگڑ گئی۔ ڈاکٹروں

نے طاقت کا انجکشن لگایا اور کہا:

''جناب ہم نے آپ کو طاقت پہنچانے کا انجکشن لگایا ہے جلد ہی اثر ہوگا خدا کو منظور ہوا تو آپ زندہ سلامت رہیں گے۔''

جواباً سر ہلاتے ہوئے نحیف آواز میں کہا ''نہیں اب نہیں۔'' پھر کچھ کہا جس کے دو لفظ اللہ اور پاکستان سمجھ میں آسکے اس کے بعد ان پر بے ہوشی طاری ہوگئی دس بج کر بیس منٹ پر جب ڈاکٹر الٰہی بخش نے ان کے دل کی حرکت کو سننے کی کوشش کی تو کسی حرکت کا احساس نہ ہوا۔ جس دل کی دھڑکن سے کبھی طوفانوں کے دل دہل جاتے تھے۔ وہ دل بڑی خاموشی سے اپنے رب کے ایک اشارے پر خاموش ہو چکا تھا۔

اللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر .... اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

آخری باتیں

آٹھ دس ہفتے کی اس علالت کے دوران میں بھی جب قائداعظمؒ صاحب فراش تھے وہ تقریباً آخری دنوں تک اپنے فرض منصبی کی ذمہ داریاں بڑے انہماک اور دلچسپی سے ادا کرتے رہے ان کے دل و دماغ کی تابندگی اور چستی میں آخری لمحات تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی بہن، سیکرٹری اور معالجوں سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے تھے بلکہ بحث بھی کرتے تھے۔ ڈاکٹروں سے دواؤں، پرہیز اور علاج کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے تھے۔ انہی مجلسوں میں وہ مختلف قومی مسائل اور مباحث پر اظہار خیال بھی کرتے رہتے تھے ان کے سیکرٹری فرح امین، ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش اور خوش قسمتی سے ان کے دوسرے معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے اپنی ڈائری ''قائداعظم کے آخری لمحات'' میں قائداعظم کے تاثرات کو تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔

موت اور زندگی

27 جولائی 1948ء کو قائداعظم نے ڈاکٹر ریاض شاہ سے طبی معائنے کے دوران کہا:

''میں نے آج تک کبھی اپنی صحت کی پرواہ نہیں کی۔ اور آئندہ کے لیے خیال کرنے کو تیار ہوں۔ موت اور زندگی سب خدا کی طرف سے ہے موت وقت معین سے پہلے نہیں آسکتی۔ یہ میرا ایمان ہے۔ میں خداوند قدوس کی ذات کے سوا اس دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ موت کا خوف مجھ پر طاری نہیں۔ جب کہ موت کو آنا ہے اور ضرور آنا ہے تو پھر موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔''

پاکستان ایک زندہ حقیقت۔ بے انتہا امکانات

قائداعظم نے فرمایا:

''پاکستان ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایک ایسی حقیقت جس کا دوست اور دُشمن سب ہی اعتراف پر کرنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان کا مستقبل درخشاں ہے۔ میری روح کو تسکین ہے۔

میرے دل کو اطمینان ہے کہ برصغیر میں مسلمان غلام نہیں۔ بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے آزاد مملکت کے مالک ہیں آج اپنا وطن ہے آزاد اور خود مختار وطن۔ جس کی ترقی کی شاہراہیں وسیع ہیں اور جس کا مستقبل روشن ہے۔''

سجدۂ شکر

''جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میری قوم آزاد ہے تو میرا سر عاجزی سے بارگاہِ رَبُّ العزت میں جھک جاتا ہے۔''

یہ کہہ کر قائداعظمؒ کی آنکھوں میں چمک آ گئی چہرے پر سرخی دوڑ گئی آواز بلند ہوتی گئی۔ آپ نے کہا:

''یہ مشیت خداوندی اور رسول ﷺ کا فیض کہ جس قوم کو برطانوی اور ہندو سامراج نے برِصغیر سے حرفِ غلط کی طرف مٹانے کی سازش کر رکھی تھی۔ آج وہ قوم آزاد ہے۔ اس کا اپنا ملک ہے۔ اپنا جھنڈا ہے۔ اپنی حکومت، اپنا سِکّہ ہے اور اپنا آئین و دستور ہے۔ کیا کسی قوم پر اس سے بڑھ کر خدا کا کوئی اور انعام ہو سکتا ہے؟

یہی وہ خلافت ہے جس کا وعدہ خدا نے اپنے پیارے رسول

اکرم ﷺ سے کیا تھا۔ اگر تمہاری امت نے صراطِ مستقیم کو اپنے لیے منتخب کرلیا تو ہم اسے زمین کی حکومت دیں گے۔ خدا کے اس انعامِ عظیم کی حفاظت اب سب مسلمانوں کا فرض ہے۔ اگر مسلمان نیک نیتی، دیانت داری، خلوص اور نظم و ضبط سے دن رات کام کرتے رہے اور اگر ان میں ذاتی مفاد، جاہ طلبی اور نفاق کا مرض پیدا نہ ہوا تو ان شاء اللہ چند سالوں میں دنیا کی بڑی قوموں میں اُن کا شمار ہونے لگے گا۔ ان کا ملک امن و آشتی، تہذیب و تمدن، ثقافت و شرافت کا مرکز ہوگا اور اس کی حدود سے ترقی کی شعاعیں نکل کر سارے ایشیا کی راہ نمائی اور رہبری کریں گی۔ اور ایشیا کو امن و ترقی کا راستہ دکھائیں گی۔''

پاکستان کے صنعتی ملک بننے کے امکانات

ایک شام آپ نے فرمایا:

''میں جانتا ہوں کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ لیکن صنعتی میدان میں آنے سے پہلے جاپان کے وسائل پاکستان سے کم تھے۔ نہ کوئلہ تھا اور نہ لوہا، دوسری دھاتیں بھی ناپید تھیں۔ لیکن

جب جاپانیوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنانے کا عزم کرلیا تو
انہوں نے ہر مشکل پر قابو پالیا۔ ہر دشواری کو آسان بنا دیا۔ نا
ممکن کو ممکن بنا دیا۔ پاکستان زرعی ملک ہے لیکن پاکستان کو صنعتی
ملک بنانے کے لیے تمام وسائل ذرائع اور معدنیات ملک میں
موجود ہیں۔ پاکستان کے پہاڑی علاقے، میدان اور ریگستان
بے اندازہ قدرتی وسائل کے حامل ہیں۔ بس ضرورت محنت
اور کوشش کی ہے۔"

یہ کہنے کے بعد پاکستان کے علاقوں کی صنعتی پس ماندگی کی وجوہات پر بھی
آپ نے روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا:

"پاکستانی علاقوں کے متعلق برطانوی حکومت کی شروع سے یہ
پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کو صنعت، تجارت اور تعلیم کے
میدان میں پس ماندہ رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز
مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھتے تھے انہیں یقین تھا اگر مسلمان صنعتی
اور تعلیمی میدان میں ترقی کریں گے تو لازمی طور پر وہ اپنے
کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کی منظم جدوجہد کریں
گے۔ اور برطانوی اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہوں
گے۔ اس مفروضے کی بنا پر انگریزوں نے اپنے دوصد سالہ دور

حکومت میں ہندوؤں کو ہر میدان میں ابھارا اور مسلمانوں کو قصداً پس ماندہ رکھا۔"

زیارت سے کوئٹہ آنے پر قائداعظم کی طبیعت قدرے بہتر ہوگئی ان دِنوں وہ اکثر پاکستان کی صنعتی ترقی پر اظہارِ خیال کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کے مستقبل کے علاوہ وہ کسی اور موضوع پر سوچتے ہی نہیں تھے۔

مسلمانوں سے پُر امید

ایک دوسرے موقع پر آپ نے کہا:

"پاکستان کو ترقی دینے کے ذرائع اس ملک میں موجود ہیں۔ قدرت کی فیاضی نے اس ملک کو دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ ضرورت صرف محنت، خلوص اور دیانت داری کی ہے اگر پاکستانی مسلمانوں میں یہ اوصاف پیدا ہو جائیں۔"

یہ کہہ کر ذرا ٹھہرے پھر پورے یقین سے کہا:

"ان شاء اللہ میری قوم میں یہ اوصاف پیدا ہو کر رہیں گے۔ میں مسلمانوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اسلامی تعلیمات میں مایوسی کا لفظ تک نہیں، زندہ قوموں کو انتہائی مصائب اور مشکلات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے مصائب اور آلام کی

آندھیوں، مشکلوں کے طوفان دشمن کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ خدا ہمیشہ ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے جنہیں وہ زمین کی خلافت عطا کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ صدیوں کی غلامی نے مسلمانوں کے دماغوں کو شل کر دیا ہے۔ انہیں آزاد قوم کی طرح ملک کی تعمیر میں حصہ لینا چاہیے جب بھی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ وہ آزاد ہو چکے ہیں تو اس کے بعد پاکستان کے عظیم ملک بننے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔"

مستقبل سے پُر امید

آغازِ پاکستان کے انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود قائداعظمؒ پاکستان کے مستقبل سے بہت پرامید تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"میں آپ میں موجود نہیں ہوں گا لیکن آپ دیکھ لیں گے کہ پاکستان چند ہی سالوں میں دُنیا کا عظیم ترین ملک بن جائے گا۔ پاکستان میں مردم خیزی کی صلاحیت موجود ہے بہترین دل و دماغ کے انسانوں کی کمی نہیں ہے۔ ذرا دماغوں پر زنگ لگ گیا ہے جب یہ زنگ اتر گیا تو پاکستان ایسے گوہرِ گراں قدر

پیدا کرے گا۔ جن کے فہم و فراست، تدبر اور قوّت سے
پاکستان زندگی کے ہر میدان میں قابل رشک ترقی کرے گا۔''

دماغوں کو زنگ لگنے کا سب سے بڑا سبب مروجہ نصابِ تعلیم اور طریق تعلیم تھا۔ قائداعظمؒ کی ہمہ گیر نظر اس پہلو پر بھی تھی چنانچہ اس سلسلے میں آپؒ نے فرمایا:

''موجودہ نصاب اور طریق تعلیم غلام سازی کی محرک ہیں۔ ملکی
اور قومی ضروریات کے مطابق انہیں قطعاً بدل دینا ہوگا۔
نوجوان اور بچوں کو شروع ہی سے ان کے ذہنی رجحانات کے
مطابق تعلیم دینی ہوگی۔''

زیارت سے کوئٹہ آکر ان کی صحت تو بہتر ہوگئی لیکن طبیعت افسردگی کی طرف مائل تھی۔ ڈاکٹروں نے امید ظاہر کی کہ ان کی صحت پہلے چند سال کی طرح اچھی ہو جائے گی۔ اس پر انہوں نے کہا:

''چند سال پہلے یقیناً میری یہ آرزو تھی کہ میں زندہ رہوں۔
زندگی کی خواہش اس لیے نہیں تھی کہ میں موت سے ڈرتا تھا
بلکہ اس لیے زندہ رہنا چاہتا تھا کہ قوم نے جو کام میرے سپرد کیا
تھا اور قدرت نے جس کام کے لیے مجھے مقرر کیا ہے میں اسے

پایہ تکمیل تک پہنچا سکوں۔ اب وہ کام پورا ہو چکا ہے۔ اب یہ قوم کا کام ہے وہ اس کی تعمیر کرے۔ اسے مضبوط اور ترقی یافتہ بنائے' میں اپنا فرض پورا کر چکا ہوں اب مجھے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

اس پر ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش اور ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے بیک آواز کہا:

"خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے۔ آپ کے بعد کون ہے جو قوم کی کشتی کو اس بھنور سے نکال کر ساحل مراد تک پہنچا سکے۔"

قائداعظم نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور فرمایا:

"قدرت حالات کے مطابق ایسا آدمی پیدا کر دیا کرتی ہے جس کی وقت اور حالات کو ضرورت ہوتی ہے۔"

پھر اپنی گمبیھر آواز میں گویا ہوئے:

"گھبراؤ نہیں" خدا پر اعتماد رکھو۔ اپنی صفوں میں نقص نہ آنے دو۔ انتشار نہ پیدا ہو، دیانت اور خلوص کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ قوم کے مفاد کو ذاتی مفاد پر کبھی ترجیح نہ دو۔"

ان کی صحت پھر گرنے لگی تھی لیکن ان کی سوچ کا مرکز پاکستان اور اس کا مستقبل ہی تھا پاکستان کے دفاع میں ان کی دلچسپی سب سے زیادہ تھی ایک دن اور

یہ دِن ان کی زندگی کے بالکل آخری دنوں میں سے ایک تھا۔ فرمایا:

''اندرونی اور بیرونی دفاع کا مسئلہ خاص طور پر توجہ طلب ہے پاکستان کا ہر مرد اور پاکستان کی ہر عورت اپنے آپ کو قومی سپاہی تصور کرے۔ ہم نے لاکھوں مسلمانوں کی قربانی دے کر جو آزادی حاصل کی ہے اس کی حفاظت کے لیے ہمیں ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بھوکے رہ کر ملک کی دفاعی ضرورت کو پورا کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے اگر کسی دشمن نے پاکستان کی آزادی پر حملہ کیا تو پاکستان اپنے آخری فرزند تک حملہ آور کے خلاف جنگ جاری رکھے گا۔ حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کو دفاع کے سوال کو تمام دوسری ضروریات پر مقدم رکھنا چاہیے۔''

چین کے ایک نامور شاعر کا نذرانہ عقیدت

جناح! اے استقامت، جہاد اور انقلاب کے نشان!
جسے صحراؤں کے خانہ بدوش بھی پہچانتے تھے،
اور سندھ کے کناروں پر بسنے والے بھی،
میرا ٹوٹا ہوا دل آج غم کے مقابلے میں عاجز ہے،
میں رونے پر مجبور ہوں،
اگرچہ آنسو میرے غم کی شدت کے اظہار سے قاصر ہیں،
جناح!
رُوح انسانی تجھے کبھی نہ بھول سکے گی!
حکمرانوں کی نخوت اور دشمنوں کی لذت خون آشامی برقرار رہے گی،
لیکن تو صبر و اطمینان سے اپنی آنکھیں بند کر لے!

کیونکہ جنگلوں میں
اور ساحلوں پر
تیرے بیٹے (ہی نہیں)
تیری بیٹیاں (بھی)
تلواریں ہاتھوں میں لیے حق کی حمایت کرتی رہیں گی،
وہ تیرے طویل جہاد کو
از سر نو شروع کریں گے اور یہ نسل ہی
تیرا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دے گی!
یہ صرف ایک نوحہ نہیں
حلف ہے!

(لوہ ینگ)

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کا تجزیہ

قائداعظم کی غیر معمولی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ اندھی عقیدت یا اندھی وفاداری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نہ انہوں نے خود کسی کو بت بنایا تھا، نہ انہیں خود بت بننا منظور تھا۔ وہ تجزیاتی اور تجرباتی ذہن رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستانی عوام وخواص بھی یہی غیر جذباتی ذہن ورویہ اختیار کریں تاکہ وہ موجودہ زمانے کے پیچیدہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل سے بہتر طور پر عہدہ برآ ہو سکیں۔

قائداعظم بلاشبہ اس دور کی عظیم شخصیت تھے ان کی عظمت کا اعتراف ان کے دوستوں ہی نے نہیں دشمنوں نے بھی کیا ہے سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا راز کیا تھا؟ کس چیز نے قائداعظم کو قائداعظم بنایا۔ وہ کونسی صِفات تھیں جن کی وجہ سے وہ تخلیق پاکستان کی جنگ اتنے نامساعد حالات میں جیت سکے؟

اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ عظمت ذاتی نہیں اجتماعی ہوتی ہے ایک لیڈر کو حالات اور تاریخی عوامل کا دھارا عظیم بنا دیتا ہے۔ لیڈر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تاریخی عوامل کے دھارے کو خاطر خواہ رُخ دے سکے اور اجتماعی طاقت سے اپنی فراست کے مطابق کام لے سکے۔ اس نقطۂ نظر کا جواب یہ ہے کہ یہی تو عظمت ہے، تاریخی عوامل کی طاقت کو اپنے قومی مفاد کے مطابق زیر کر لینا ہی تو بڑائی ہے حالات اور عوامل تو سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں جو ان سے خاطر خواہ کام لے سکے اسی کو تو ''میر کارواں'' کہتے ہیں۔

شخصیت کی تکون کے تین ضلعے ہوتے ہیں وراثت، ماحول اور کردار، قائداعظم کی عظمت کو ان ہی تین گوشوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے نسلی اور خاندانی خصوصیات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

''نقوش قائداعظم'' نامی کتاب میں اسد ملتانی کی روایت اور قائداعظم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''قائداعظم نسلاً پنجابی راجپوت تھے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں جب قائداعظم باغبت ضلع میرٹھ کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے تو نواب باغبت نے قائداعظم سے کہا آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے آپ میں یہ کڑک کہاں سے آئی؟ اس پر قائداعظم نے مسکرا کر

جواب دیا، نواب صاحب میں تو پنجابی راجپوت ہوں کئی پشتیں گزریں میرے ایک جد کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کرلی اور انہی کے خاندان میں مل گئے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے۔ میرے وہ جدّ جو کاٹھیاواڑ چلے گئے تھے۔ ضلع منٹگمری کے رہنے والے تھے۔"

اس روایت کی تصدیق کسی اور سوانح نگار نے نہیں کی ہے کتاب قائداعظم جناح کے معتبر مصنف جی الانہ نے جنہیں قائداعظم سے مدتوں ذاتی شرف نیاز حاصل رہا تھا۔ صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ:

"محمد علی جناح کے آباؤاجداد کاٹھیاواڑ کے رجواڑے گونڈل کے گاؤں پانیلی کے باشندے تھے ان کے دادا پونجا میگھ جی کا کپڑے بننے کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور ان کا شمار گاؤں کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ پونجا میگھ جی کے تین بیٹیوں والجی بھائی، نتھو بھائی، جناح بھائی میں سے سب سے چھوٹے جناح پونجا سب سے زیادہ باحوصلہ اور باہمت تھے اور تجارتی ذہن رکھتے تھے اپنی تجارتی تگ وتاز کے لیے گونڈل کا میدان تنگ پاکر جناح پونجا کراچی منتقل ہوگئے اور اپنی تجارتی فراست و ذہانت اور

محنت سے انہوں نے ایکسپورٹ، امپورٹ اور بینک کاری کے
کاروبار کو خوب چمکایا۔"

لیکن جناح پونجا محض کاروباری آدمی نہیں تھے وہ کراچی کے ایک انگریزی اسکول چرچ مشن میں استاد بھی رہے تھے خود بھی انگریزی جانتے تھے۔ سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے کراچی کے باشعور مسلمانوں کے ساتھ 1885ء میں سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد رکھنے میں عملی مدد دی تھی۔ محمد علی جناح کے ننھیال کے بارے میں بھی کچھ نئی معلومات منظر عام پر آئی ہے جو ان کی وراثت کے مطالعہ میں اہمیت رکھتی ہیں۔ محمد علی کی والدہ شیریں بی جو سسرال میں اپنے حسن صورت و سیرت کی وجہ سے مٹھی بائی کے نام سے مشہور ہوئیں، نسلاً ایرانی تھیں۔ وہ آغا خان اول کے ایک وزیر موسیٰ جمعہ کی بیٹی تھیں۔

1874ء میں ان کی شادی جناح پونجا سے ہوئی تھی شیریں بی کا خاندان اپنی نجابت، شرافت اور علم وفضل میں یکتائے روزگار تھا۔ قیاس کہتا ہے کہ شیریں بی فہم وفراست میں یگانہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم وفضل میں بھی کچھ نہ کچھ دخل رکھتی ہوں گی۔ فارسی، عربی تو جانتی ہوں گی۔ اسماعیلی عقیدہ تو خیر پونجا خاندان کا بھی تھا۔ اسماعیلی ناصر امام آغا خان سے اتنا قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے مذہبی قدروں سے ان کی وابستگی بھی زیادہ ہوگی۔

کہا جاتا ہے محمد علی جناح کا نام "محمد علی" ان کے ماموں اسماعیلی امیر کبیر

قاسم موسیٰ نے رکھا تھا ان کی ماں پیار سے انہیں محمد کہتی تھیں۔ جناح پونجا کے گھرانے کے گجراتی ماحول میں یقیناً یہ نئی بات ہوگی یہ تحقیق تو نئی ہے اس سے پہلے تو محمد علی جناح کی والدہ کے بارے میں جو معلومات تھیں ان بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مذہبی دل و دماغ کی نہایت سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی صوفی بزرگ حسن پیر سے عقیدت رکھتی تھیں۔ ان کے اصرار پر محمد علی کو عقیقے کے لیے حسن پیر کی درگاہ پانیلی لے جایا گیا تھا اور وہاں پورے روایتی انداز سے ان کے عقیقے کی رسوم ادا کی گئیں۔

ان حقائق سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کے ماں باپ دونوں روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے باپ سے انہوں نے ہمت و حوصلے سے کام کرنا محنت کرنا اپنے اوپر اعتماد کرنا۔ نئی راہیں نکالنا اور جزرسی سیکھی۔ ماں کی طرف سے شائستگی، نفاست اور مذہبی و اخلاقی قدروں سے وابستگی انہیں ورثے میں ملی۔ لیکن قائداعظم کی عظمت کو محض وراثت اور خاندان کے اثرات کے حوالے سے نہیں سمجھا جا سکتا ان کے پائے کے عظیم انسان اپنی دنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لندن میں اپنی تجارتی فرم کی ناکامی پر انہوں نے خود ہی قانون پڑھنے کا فیصلہ کیا اس کے بعد سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ بھی ان کا اپنا تھا ان دو فیصلوں کی راہ میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بھی انہوں نے خود اپنی فراست، خود اعتمادی اور قوت ارادی سے عبور کیں۔

1896ء میں جب وہ بیرسٹر بن کر کراچی آئے تو ان کے والد کا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ خاندان مالی بحران کا شکار تھا۔ بہ ظاہر بہتر یہی نظر آتا تھا کہ وہ کسی قانونی فرم میں ملازم ہو جاتے اور اپنی مالی حالت مستحکم کرتے۔ ایسی ملازمتوں کے امکانات بھی موجود تھے بلکہ کہا جاتا ہے کہ ایسی جگہیں پیش بھی کی گئی لیکن محمد علی نے اس جال میں پھنسنے سے انکار کردیا اور صرف اپنے حوصلے وعزم کو ساتھ لے کر وسیع تر امکانات کے شہر ''بمبئی'' میں اپنے لیے نئی منزلیں تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

نہ صرف انہوں نے اپنے آبائی پیشے تجارت کو خیر باد کہا۔ بلکہ آبائی عقیدے میں بھی اپنی فہم اور رائے کے مطابق ترمیم کی ان کے خاندان کے سب لوگ اسماعیلی شیعہ عقیدے کے تھے۔ آغا خان کو امام حاضر مانتے تھے۔

ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق انہوں نے اکیس سال کی عمر میں آبائی عقیدے کو چھوڑ کر اپنے سارے خاندان سمیت ''اثنا عشری'' مسلک اختیار کر لیا یہ ان کی خوداعتمادی کی بہت واضح مثال ہے مختصر یہ کہ انہیں والدین سے بھی بہت کچھ ملا۔ ماحول سے بھی انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ تعلیم وتربیت نے بھی ان کے جوہر چمکائے لیکن وہ صفات وہ قدریں، وہ رویے، وہ عادات، وہ اصول وہ کردار اور وہ ذہن جس نے انہیں چمڑے کے ایک تاجر کے بیٹے سے ایک قوم کا قائداعظم اور ایک ملک کا خالق بنا دیا اور وہ ان کے انفرادی کردار کا کارنامہ تھا۔ اس

لیے ان کی عظمت کا سراغ ان کے کردار کے تجزیے سے مل سکتا ہے۔

اس لحاظ سے ان کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا جائے تو ان کے کردار کی دو خصوصیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو اپنے لیے خود سوچ سکنا۔ اپنے لیے خود فیصلہ کر سکنا اور پھر اس خود اعتمادی سے کیے ہوئے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لیے ارادے کی غیر معمولی قوت۔

سب سے مشکل کام دوسروں کے مشورے اور حالات کے رُخ کے خلاف اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ذہانت ہی نہیں ذہنی جرأت بھی چاہیے۔

اس کے بعد اس فیصلہ پر حوصلے سے عمل کرنے اور کرتے رہنے میں اپنے اُوپر اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے مقصد پر اعتماد کی بھی اور محنت و جفاکشی کی عادت کی بھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کے کردار میں یہ تینوں صفتیں قوت فیصلہ، قوت ارادی اور بے انتہا اور مسلسل محنت کی صلاحیت کمال کے درجے میں موجود تھیں۔ سندھ مدرسے کی طالب علمی کے زمانے میں وہ رات گئے تک پڑھتے تھے اور اس روز کا کام ختم کیے بغیر نہیں سوتے تھے مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک رشتے دار خاتون نے انہیں صحت کی خاطر دیر تک پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے کہا بائی جی میں محنت نہیں کروں گا تو بڑا آدمی کیسے بنوں گا؟ انہوں نے کہا قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ خود کیا۔

وہیں لندن میں اٹھارہ انیس برس کی عمر میں انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی اور خود فیصلہ کیا کہ وہ عملی سیاست میں حصہ لیں گے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ بلکہ ایک موقع پر تو انہوں نے دادا بھائی نورو جی کی طرح انگلستان میں رہ کر انگلستان کی پارلیمنٹ کا انتخاب لڑنے اور انگریز سیاست دانوں سے برابری کی سطح پر ٹکر لینے کے بارے میں بھی سوچا۔ سیاست میں حصہ لینے کا جو فیصلہ انہوں نے آغاز جوانی میں کیا تھا اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ، کوئی ذاتی فائدہ نہ آسکا۔

جب انہوں نے 1900ء میں بمبئی میں پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی عارضی جگہ قبول کی تو یہ فیصلہ بہت سوچ کر کیا گیا تھا۔ جیسے ہی وکالت جمنے کے امکانات ہوئے انہوں نے اس جگہ کو اس زمانے کے 1500 روپے ماہوار پر مستقل طور پر قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اتنی رقم تو میں ہر روز کمانا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنے اوپر اعتماد تھا ان کی نظر مستقبل پر تھی ان کے ارادے میں اتنی قوت تھی کہ جو مشکل فیصلہ کریں اس کو آخر تک نبھائیں بھی، خواہ وہ بہن رحمت بائی کی برادری سے باہر شادی کا مسئلہ ہو یا چھوٹی بہن فاطمہ کو باندرہ کے کانوٹ اسکول میں پڑھانے کا مسئلہ یا خود اپنی شادی اور پھر علیحدگی کی بات، یا بیٹی دینا کو عاق کر دینے کا فیصلہ، یہ ان کے اپنے فیصلے تھے اور انہوں نے اپنی قوت ارادی اور فراست سے انہیں آخر وقت تک نبھایا یہی معاملہ سیاسی فیصلوں کا تھا۔

1894ء میں انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کا عہد کیا تھا۔تمام عمر وہ اس پر قائم رہے اسی زمانے میں وہ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے قائل تھے۔اس معاملے میں وہ بیشتر کانگریسی ہندو لیڈروں سے زیادہ مخلص تھے۔ 1916ء کا لکھنؤ پیکٹ، 1929ء کے 14 نکات، 1932ء کی گول میز کانفرنس، 1937ء کے انتخابات سے 1946ء کے کیبنٹ مشن تک انہوں نے نہایت ایمان داری اور سچائی سے مسلمانوں کے جائز مفادات کے تحفظ کے ساتھ اتحاد کی کوشش کی۔

یہ وفاداری بشرط استواری کی بہترین مثال تھی۔ 1920ء میں گاندھی اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریک عدم تعاون سے تعاون نہ کرنا ان کی قوت فیصلہ اور سیاسی فراست کا بہت سخت امتحان تھا۔عوامی لیڈروں کے لیے عوام کے جذبات اور رجحان کے خلاف فیصلہ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن محمد علی جناح اس سخت امتحان سے بھی کامران گزرے۔ اس سے پہلے وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ 1934ء میں انگلستان سے آکر انہوں نے مسلم لیگ کو ایک فعال اور منظم عوامی جماعت بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا تو کم وبیش وہ تنہا تھے۔ اس زمانے کے بڑے مسلمان لیڈر مسلم لیگ میں نہیں تھے۔

مسلم لیگ کو منظم کرنے کے سلسلے میں وہ اے کے فضل الحق، سہروردی، سر

سکندر، ایسے با اثر لیڈروں سے نبٹتے رہے اور جب 1937ء میں کانگریس کے رویے سے ان کو یقین ہوگیا کہ ہندو، مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے پر کسی قیمت پر تیار نہیں تو انہوں نے پاکستان سے کم تر کسی چیز پر راضی ہونے سے انکار کردیا اور 23 مارچ 1940ء سے قرارداد پاکستان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ سن 42 کا کرپس مشن سن 45 کی شملہ کانفرنس اور 1946ء کی کیبنٹ مشن سارے سیاسی مذاکروں میں ان کے فیصلے اور ارادے کے بڑے بڑے امتحان آئے لیکن وہ پہاڑ کی طرح جمے رہے اور آخر کار 3 جون 47ء کے اعلان سے پاکستان کا قیام ممکن ہوا۔

ان کی قوت ارادی کا امتحان جسمانی سطح پر بھی ہوا۔ 41ء سے ان کی صحت متاثر ہونے لگی تھی۔ سن 45۔46 اور 47ء کے تین سالوں میں وہ مہلک بیماری اثر کرنے لگی تھی۔ لیکن صرف اپنی قوت ارادی اور جذبے سے انہوں نے بیماری کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا اپنی آخری علالت میں وہ اگست 48ء کے اواخر تک فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ یکم جولائی 48ء کو اسٹیٹ بنک کے افتتاح کیلئے وہ علالت کے بستر سے اُٹھ کے آئے تھے۔ ان کی جرأت کا ایک امتحان تو فروری 43ء میں آیا تھا۔ جب رفیق صابر نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ان کے عزم و حوصلے، امتحان کا وہ وقت بھی کم نہیں تھا۔ جب 5 اگست 47ء کو نجی ملاقات میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں بتایا کہ سی آئی ڈی کی اطلاعات کے مطابق 14 اگست 1947ء کو

کراچی میں آزادی کی تقریبات کے دوران سکھوں کی طرف سے اُن پر قاتلانہ حملے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ یہ خفیہ اطلاع انہوں نے سکون سے سنی اور پھر اعتماد سے کہا۔ آزادی کی تقریبات اپنے پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گی۔ جی الانہ نے لکھا ہے کہ قتل کے اس منصوبے کی اطلاع ستر برس سے زائد عمر میں بھی ان کی قوت ارادی، حوصلے اور اعتماد کو متزلزل نہ کرسکی۔

خوف وہ چیز تھی جس سے وہ واقف ہی نہیں تھے۔ صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی فراست اور پھر اس فیصلہ پر پختہ عزم و حوصلے کے ساتھ قائم رہنے کی جرأت اور قوت، یہ قائداعظم کی کردار کی دو اہم خصوصیات تھیں۔ لیکن ایک تیسری خصوصیت بھی جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ یعنی ان کا وہ جذباتی نقطہ نظر تھا۔ وہ جذباتی فیصلے نہیں کرتے تھے بلکہ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر تمام مضمرات پر نظر کر کے ذاتی اور سیاسی فیصلے کرتے تھے۔ وہ جذباتی تو تھے حساس بھی بہت تھے لیکن جذباتیت کا شکار ہرگز نہیں تھے۔

1917ء میں وہ سر ڈنشا پٹیٹ کی اس تجویز پر راضی ہو گئے کہ رتن بائی ان سے شادی کرنے کے ارادے کو ایک سال تک ملتوی کر دیں۔ اس سے ان کے دل کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی لیکن جیسا کہ جی الانہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ رتن بائی کو سال بھر بعد آزادانہ فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ خواہ وہ فیصلہ ان کے خلاف ہی کیوں نہیں پڑتا۔ یہ تو ذاتی محبت کی بات تھی۔

1920ء میں تحریک عدم سے اختلاف کرنے کا فیصلہ بالکل غیر جذباتی فیصلہ تھا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں مولانا بھاشانی کے سلسلے میں اُن کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

"بے کار جذباتی باتوں اور رقیق القلبی کے لیے سیاست میں کوئی جگہ نہیں۔ سیاست شطرنج کی بازی ہے اور برائیوں کا مداوا آنسوؤں میں نہیں بلکہ محنت، جرأت اور عزم سے ہی ہوسکتا ہے۔ شدید سیاسی بحران کے زمانے میں دماغ کو ٹھنڈا اور آنکھوں کو خشک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ انسان صاف طور پر دیکھ سکے اور فیصلہ کر سکے۔"

برصغیر کی سیاست کا روایتی انداز اور لب و لہجہ جذباتیت کا رہا ہے۔ عوام کا مزاج بھی یہی ہے اس کے باوجود خود ان کی سیاست جذباتیت سے عاری تھی۔ وہ عوام کے سامنے سیاسی تقریروں میں بھی جذباتی ہونے کے بجائے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل، واضح اور پُر جوش طریقے سے پیش کرتے تھے۔ عام لوگوں کو صرف خوش کرنے یا وقتی طور پر ہم خیال کرنے کے لیے جذباتی خطابت کے ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیتے تھے۔ وکالت میں بھی ان کا انداز یہی تھا۔ جذباتیت سے بلند ہونا قائداعظم کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔

قائداعظم کے کردار کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت جو انہیں برصغیر کے تمام سیاست دانوں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے وہ ان کی دیانت ہے۔ نفسیاتی

بھی، ذاتی بھی، اخلاقی بھی اور سیاسی بھی ہر سطح پر ان کی دیانت بے نظیر و بے مثال تھی۔ ان کی عظمت کا یہ ایک عجیب رُخ تھا کہ وہ فراست ہی میں نہیں دیانت میں بھی جواب نہیں رکھتے تھے۔

وہ ایک باضمیر انسان اور ایک باضمیر سیاست دان تھے لوگ محبت جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے ہمعصر بھی ایسا ہی کرتے تھے لیکن وہ ان میدانوں میں بھی جائز کو جائز ہی سمجھتے تھے ان کا واسطہ انگریز اور ہندو دو ایسی طاقتوں سے تھا جو کسی خانے بند نہیں تھیں۔ لیکن قائداعظم پھر بھی سیاسی جنگ میں کبھی معیار سے نہیں اترے۔ جو سوچا وہ کہا جو صحیح سمجھا وہ کیا جو وعدہ کیا پورا کیا۔ بمبئی میں 1896ء سے 1899ء تک تین سال تک کا عرصہ ان کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ مقدمے تقریباً نہیں ملتے تھے۔ خرچ جاری تھے خاندان کی کفالت بھی ان کے ذمہ تھی۔ روپے کی اشد ضرورت تھی اس زمانے میں بعض دلالوں نے کمیشن پر مقدمے دلانے کی پیش کش کی۔ لیکن انہوں نے ان تجویزوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں ان کے الفاظ بھی نقل کیے ہیں۔ انہوں نے کہا:

> ''میں بھوکا مرجانے کو اس طرح کی تجاویز قبول کرنے پر ترجیح دوں گا۔''

تحریک عدم تعاون کا زور توڑنے کے لیے حکومت ان کے تحریک عدم تعاون کے رہنماؤں سے اختلافات سے فائدہ اُٹھا کر انہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتی

تھی۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے انہیں ججی، لامبری، سر کے خطاب غرض ہر قسم کے اعزاز کی پیش کش کی۔ انہوں نے ہر پیش کش کو مسترد کر دیا ریمزے میکڈانلڈ نے گورنری کا جال بھی ڈالا تھا۔ اس سے بڑی بات یہ کہ تحریک عدم تعاون سے عدم تعاون کر کے بھی انہوں نے حکومت سے تعاون نہیں کیا ان کا اختلاف بھی اصولی ہوتا تھا۔

اتفاق بھی اصولی جب وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے انتخاب لڑ رہے تھے تو ان کے دو مخالفوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ ان سے اپنے حق میں بیٹھ جانے کے لیے کہیں رسماً ہی سہی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اور ووٹنگ جاری رہی۔ اصفہانی نے لکھا ہے کہ 46 کے انتخاب میں کلکتے کی ایک اہم سیٹ کے لیے مخالف امیدوار نے زر ضمانت لے کر بیٹھ جانے کی پیش کش کی چند سو روپوں کی بات تھی۔ عبدالرحمٰن صدیقی اور اصفہانی دونوں پیسے دینے پر راضی تھے۔

قائداعظم نے سنا تو حکم دیا کہ انتخاب لڑا جائے اور مخالف امیدوار کی دست برداری کو کسی قیمت پر نہ خریدا جائے۔ پیسوں کی نہیں اصول کی بات تھی۔ بعد کو انہوں نے اصفہانی سے کہا:

''بیٹا! سیاست میں اخلاقی دیانت، نجی زندگی کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اگر تم عوام کی زندگی میں کسی غلطی کے مرتکب ہو گے تو تم بہت زیادہ ایسے انسانوں کو نقصان پہنچاؤ گے۔ جو تم

پر انحصار رکھتے ہیں۔"

اسی طرح کا ایک واقعہ جی الانہ نے بھی اپنی کتاب قائداعظم جناح میں لکھا ہے۔ 1946ء میں سندھ میں صوبائی اسمبلی کے انتخاب ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ساری سیٹیں جیتنا چاہتی تھی۔ اور یہ بہت اہم تھا، ایک سیٹ سے مسلم لیگ کے امیدوار قاضی اکبر کا مقابلہ جی ایم سید کر رہے تھے انہیں ان کے اپنے مریدوں کے حلقے دادو سے ہرانا آسان کام نہیں تھا۔ قائداعظم بہت فکر مند تھے۔ انہوں نے کہا:

"بیٹے! ایک بات یاد رکھیے !اگر چہ انتخابات اہم ہیں تاہم انہیں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو ہر قیمت پر کامیاب کرانا ہے لیکن دوٹروں کو کسی قیمت کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ یہ میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔"

اس بیان پر جی الانہ کا تبصرہ یہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی عظمت کا ایک اہم عنصر تھا۔ انہیں یقین تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد میں صرف اخلاقی

طریقوں ہی سے کامیابی ہوسکتی ہے۔ سیاست میں بھی اخلاقی اصولوں کو برتنے کا ایک واقعہ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے۔ شہاب صاحب بحیثیت آئی سی ایس، سی پی میں ایک کانگریسی وزیر کے سیکرٹری تھے۔ کانگریسی وزیران پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ ایک بار انہوں نے کانگریس ہائی کمان کا ایک انتہائی خفیہ مراسلہ جو مسلمانوں کے خلاف تھا ان کی تحویل میں دے دیا شہاب صاحب کی قومی عصبیت نے انہیں مجبور کیا کہ دلی جا کر وہ دستاویز قائداعظم کو دکھائیں۔ قائداعظم نے کاغذات دیکھے مسکرائے، شانہ تھپتھپایا اور پھر فرمایا:

''بحیثیت ایک مسلمان کے تم نے ایک ہندو کے اعتماد کو ٹھیس
پہنچا کر اچھا نہیں کیا۔''

یہ تھے قائداعظم جس شخص نے پاکستان بنایا اس کی قدریں یہ تھیں اور یہ کردار تھا ان کی ساری زندگی بڑائی کا ایک طویل دن تھی وہ زندگی کے ہر دور میں، ہر مرحلے میں، ہر منزل میں بڑے رہے اور یہ بڑائی بنیادی طور پر کردار کی بڑائی تھی وکالت میں، تحریر میں، تقریر میں، خلوص میں، قربانی میں، اجتماعی طور پر نہیں۔ فرداً فرداً تو ضرور ان کے حریف موجود تھے۔ لیکن سیاسی فراست، فیصلہ کی قوت، ارادے وعزم، سب سے بڑھ کر اخلاقی جرأت اور دیانت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔ ان کے اندر قیادت کی وہ صفات بعینہٖ موجود تھیں جن کی مسلم قوم کو تاریخ کے اس موڑ پر سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ایک بڑے آدمی کی بڑائی پر سب سے معتبر

گواہی دوسرے بڑے آدمی کی گواہی ہوتی ہے۔ مئی 1937ء کے خط میں اقبال نے قائداعظم کو لکھا۔

''مسلمانوں کو آپ کی قیادت کی ضرورت ہے آپ ہی ان کی کشتی کے پتوار سنبھالیں۔''

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

قائداعظم کی شخصیت کا مطالعہ

قائداعظم کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک سوال سب سے پہلے ذہن میں یہ ابھرتا ہے کہ قائداعظم کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے اپنا قائداعظم کیسے تسلیم کر لیا؟ ان پر اتنا مکمل اعتماد کیسے کر لیا۔ جب کہ برصغیر کے رہنماؤں کی روایتی خصوصیات ان کے اندر نہیں تھیں۔ مثلاً وہ روایتی معنوں میں مذہبی آدمی نہیں تھے۔ عقیدۃً اسماعیلی خوجے تھے جو مسلمانوں کی اکثریت کا عقیدہ نہیں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز شمالی ہند تھا۔ ان کا تعلق کاٹھیاواڑ بمبئی سے تھا مسلمانوں کی خاص زبان اردو، ان کی زبان نہیں تھی۔ رہنا سہنا ان کا عام مسلمانوں سے مختلف رہا تھا۔ مزاج کے اعتبار سے جذباتی وہ نہیں تھے کم آمیز وہ تھے، پھر وہ اجتماعی امنگوں کا مرکز کیسے بنے؟

یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے اس سے مسلمانوں کے معیار قیادت پر بھی

روشنی پڑتی ہے۔ یہ ایک کلید ہے کہ عام مسلمان خود لاکھ معیار سے کم تر ہوں لیکن دل سے وہ اسی رہنما کی قیادت کے قائل ہوں گے۔ جو اپنی ذاتی زندگی میں کھرا ہو۔ جس کا کردار بے داغ ہو۔ جو دولت کی ہوس سے اور نفس پرستی سے بلند ہو۔ جو کچھ شان درویشی بھی رکھتا ہو یا امارت کی صورت میں جس کا دل غنی ہو۔

عامتہ المسلمین خلوص اور بے لوثی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ قائداعظم میں یہ بنیادی صفت موجود تھی نہ انہیں خریدا جا سکتا تھا نہ جھکایا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں کو ان پر یہ اعتماد ایک روز میں نہیں ہوا۔ 1896ء سے 1947ء تک کی ان کی پچاس سال کی نجی اور سیاسی زندگی ان کے سامنے تھی۔ ان کی وفاداری اور استواری کو ہر اعتبار سے مسلم قوم نے پرکھا اور برتا تھا۔

قائداعظم پر اعتماد کے معنی یہ تھے کہ مسلمان تمام فرقہ وارانہ، علاقائی، نسلی اور تنگ نظری کے تقاضوں سے بلند ہو کر صرف اصولی اور نظریاتی سطح پر سوچنا چاہتے ہیں۔ قائداعظم کی ذات میں مسلمانوں نے ایسی قیادت کو قبول کیا جو تمام تعصبات، ذاتی خواہشات، علاقائی وصوبائی یا فرقہ وارانہ ذہنیت سے بالا تھی اور یہ کوئی تعصب کی بات بھی نہیں تھی توحید پر ایمان رکھنے سے مسلمانوں کا لاشعوری رجحان تمام حد بندیوں سے اوپر اُٹھنے کی طرف ہوتا ہے پھر قائداعظم میں ایک اور ایسی صفت بھی تھی جو مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور میں بے حد اہم ہو گئی تھی۔

یعنی ان کا تدبر اور سیاسی شعور، مشکل فیصلے کرنے صلاحیت اور ان کو

بروئے کار لانے کا حوصلہ اور ہمت، ان کا غیر جذباتی مزاج بھی اس مرحلے پر کام آیا، ان کا مقابلہ دو چالاک، شاطر لیکن تنگ نظر، تنگ دل اور تعصب سے لبریز دشمنوں سے تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے دو دھاری تلوار بن گئے تھے اور اقبال سمیت برصغیر کے مسلمانوں کو یقین ہوگیا تھا کہ اس منجدھار میں وہ مسلمانوں کی کشتی کے پتوار سنبھال سکتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہی کے ہیں۔ جو انہوں نے مئی 1937ء کے خط میں قائداعظم کو لکھے تھے۔ قیادت کے لیے صرف خلوص اور ایثار ہی کافی نہیں ہوتا اخلاق کے ساتھ کردار اور کردار کے ساتھ ذہن کی جودت کی ضرورت بھی ہوتی ہے قائداعظم ان صفات سے بھی مُتّصِف تھے۔

ہیکٹر بولیتھو کی لکھی ہوئی قائداعظم کی سوانح عمری نے ایک غلط فہمی یہ پھیلائی ہے کہ قائداعظم سرد اور سخت گیر تھے، اور ان میں انکسار کی کمی تھی۔ ایک کرائے کا مصنف ایک قوم کے ہیرو کے ساتھ کیسے انصاف کر سکتا تھا۔ ہیکٹر بولیتھو ان سے متاثر تو کیا ہوتا وہ تو ان سے براہ راست واقف بھی نہیں تھا۔ بہرحال اس نے اپنی کتاب سے جو تاثر دیا وہ وہی ہے جو قائداعظم اور پاکستان کے مخالف ہندو اور برطانوی حلقے دیتے رہے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ قائداعظم بحیثیت مجموعی سنجیدہ دل و دماغ کے حامل تھے۔ کم آمیز اور دیر آمیز، حساس لیکن غیر جذباتی، ان کے دل، ان کے دماغ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ جذباتیت ان کے اندر بالکل نہیں تھی بظاہر وہ سرد ضرور نظر

آتے تھے لیکن یہ سرد مہری بھی بامقصد اور قوم کی خاطر تھی۔ اصفہانی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ لیگ کونسل کے اجلاس کے دوران جب خواجہ ناظم الدین یکا یک بیمار پڑ گئے تو وہ ان کو دیکھنے اسپتال نہیں گئے۔ استفسار پر کہا اگر میں ایک رکن کو دیکھنے گیا تو ہر رکن کو دیکھنے جاؤں گا۔ پھر قوم کا کام کب کروں گا۔

حقیقت میں عیادت کے لیے نہ جانا بھی اصول کی بات تھی اور قوم کی خدمت کی بھی۔ ویسے اس موقع پر بھی ان کی فراست کام آئی خواجہ صاحب کو دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ صرف بدہضمی کی شکایت ہو گئی تھی۔ دوسرے روز وہ بھلے چنگے تھے۔ جو لوگ انہیں دیکھنے گئے تھے انہوں نے بھی وقت ضائع کیا تھا اب اس طرح کے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ بے حس یا ہمدردی کے جذبات سے عاری تھے غلط ہو گا بڑے آدمیوں کو عام جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ سچی محبت، شرک کو پسند نہیں کرتی قوم کی محبت اور اصولوں کی محبت کے راستے میں ان کی اپنی بیوی اور بیٹی بھی حائل نہ ہو سکی۔

تحریک پاکستان کے زمانے سے پاکستان دشمن عناصر بانیِ پاکستان کے خلاف جو پروپیگنڈہ کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ ان میں انانیت بہت تھی۔ عام لوگوں سے دور رہتے تھے اور شعار اسلامی سے بھی ان کی دلچسپی کم تھی۔

ان تینوں اعتراضوں کا جواب اس واقعہ میں ہے جو قائداعظم کے ایک

معتمد کارکن اور نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر اور ممتاز دانش ور ممتاز حسن نے دسمبر 1954ء کے ماہِ نو میں بیان کیا وہ کہتے ہیں عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے مجھے اس کا اندازہ 1946ء میں ہوا جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لیے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے اگلی صف میں بیٹھ سکیں۔ لیکن خود انہوں نے آخری صف میں بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا میں دیر سے آیا ہوں۔ کسی اور جگہ کا مستحق نہیں نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا وہ قائداعظم کو قریب سے دیکھنا اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے۔

ان میں سے ایسے بھی تھے جو اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا۔ ایک شخص پر رقت طاری ہوگئی اور اس نے دعا مانگی کہ اے خدا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ یہ سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا، کوئی چھوٹا دُکان دار، کوئی خوانچہ فروش، قائداعظم کا ارشاد تھا کہ:

> ''میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے سے خاص
> نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔''

اس واقعہ سے جو اپنی نوعیت کا تنہا نہیں۔ انکسار، غریبوں سے محبت،

بے تعصبی اور شعار اسلام سے محبت ظاہر ہوتی ہے ان کے ڈرائیور فقیر محمد کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی خدمت گار نے اسے بتایا کہ اکثر رات گئے صاحب نماز کے لیے سجدے میں ہوتے تھے۔

قائداعظم کی ظاہری سرد مہری اور سخت گیری بھی بے وجہ نہیں تھی۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی چیز سے محبت کر سکتا ہے عام لوگ اپنی اور اپنوں کی ذات میں دلچسپی رکھتے ہیں اور ان سے جذباتی محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ غیر معمولی عظیم لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی اور دوسروں کی ذات سے وابستگی سے بلند ہو کر کسی عظیم نصب العین یا بلند مقصد سے اپنی تمام دلچسپی، تمام جذباتی اور ذہنی زندگی مربوط کر دیتے ہیں۔ ان کی محبت، ان کی نفرت، ان کا جینا ان کا مرنا اسی مقصد کے حوالے سے ہوتا ہے ان کی توجہ کا مکمل ارتکاز ایک نقطے پر ہو جاتا ہے۔ اس لیے سطحی نظر کو وہ غیر جذباتی نظر آتے ہیں۔ قائداعظم کی تمام جذباتی ذہنی قوتیں ان کے قومی مشن میں اس طرح جذب ہو گئی تھیں کہ ان کے ذاتی احساسات اور جذبات نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اصولوں سے انحراف تو وہ نہ بیوی کی چاہت کے لیے کر سکتے تھے نہ بیٹی کی محبت کے لیے دوسرے تو دور کی بات ہوتے ہیں۔

بنیادی طور پر وہ حساس اور ہمدرد تھے۔ 48-1947ء میں قائداعظم کے پرسنل اسسٹنٹ فرخ امین نے ان کے حساس اور انتہائی رحم دل ہونے کے بارے میں کئی واقعے نوٹ کیے ہیں۔ فکر اور پریشانی کے ایسے موقعوں پر جب دوسرے

اعصابیت کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ظاہری سکون اور توازن کو قائم رکھتے تھے۔ تقسیم کے بعد مہاجروں کے شدید آلام اور مصائب سے اندرونی طور پر بے حد متاثر تھے۔ فرخ امین نے لکھا ہے میں نے ان دنوں انہیں دو ایک رات کی خاموشیوں میں سونے کے کمرے میں اضطراب کی حالت میں ٹہلتے دیکھا۔

قائداعظم کی شخصیت کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ غم وفکر، محبت اور ہمدردی کے جذبات کا برملا اظہار کبھی نہیں کرتے تھے۔ منافقت ان میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ ان معاملات میں بھی کھرے تھے۔ جہاں منافقت کو مصلحت کا نام دیا جا سکتا تھا۔ ممتاز حسن نے لکھا ہے کہ جب تقسیم سے ذرا پہلے فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے لگی اور ہندو، سکھوں نے بھاری مقدار میں اسلحہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ تو بعض لوگوں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ مسلمانوں کو بھی مقابلے کے لئے ہتھیار اکھٹے کرنے کی اجازت ملنی چاہیے۔ قائداعظم یہ سن کر بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے:

> ''کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل کروں اور دوسری طرف تمہارے لئے ہتھیارون کا بندوبست کروں میں ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلمانوں کی طرف سے ہو۔''

اس بے لاگ دیانت داری کا نتیجہ تھا کہ جائز سیاسی مقاصد کیلئے بھی وہ کسی کو پیسے دے کر اپنے ساتھ ملانے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ خواہ اس میں کتنا ہی بڑا

سیاسی فائدہ مضمر ہو۔ ممتاز حسن ہی راوی ہیں کہ 1937ء میں مسلم لیگ میں موثر سیاسی کارکنوں کی سخت کمی محسوس کرتے ہوئے شملہ مسلم لیگ کے ایک رکن نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے ایک کانگریسی مسلمان کو توڑ کر مسلم لیگ کے لئے کام کرنے پر آمادہ کیا وہ بہت اچھا مقرر بھی تھا اس سے مسلم لیگ کو بہت فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے معاوضے میں صرف سو روپے ماہانہ طلب کیے۔ پوری صورت حال بتانے کے بعد قائداعظم کی اجازت طلب کی گئی قائداعظم نے دوٹوک جواب دیا:

> ''دیکھو! تمہاری تجویز کو میں اس لیے منظور نہیں کر سکتا کہ یہ مسلمانوں کا اپنا کام ہے۔ اور اسے کرنے کیلئے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم ایک غریب قوم ہیں۔ اگر ہم یہ رقم دے بھی دیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قوم اس سے زیادہ رقم دے کر اسے نہیں خرید لیں گی۔''

اس مثال سے ان کی دیانت ہی نہیں فراست اور اصول پرستی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ قائداعظم نے یہ بھی بتا دیا کہ پاکستانی سیاست کا اصل اصول کیا ہونا چاہیے۔ بعض اوقات انسان کی بڑائی کا اندازہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہوتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی نے اپنی کتاب ''قائداعظم میری نظر میں'' لکھا کہ:

> ''جب وہ ان کے گھر کلکتے میں ٹھہرے تھے تو غیر ضروری بتیوں

کوگل کر دیتے تھے اور ایسا کئی بار ہوا۔''

اصفہانی نے کہا:

''آپ یہ زحمت کیوں کرتے ہیں۔''

تو ان کا جواب تھا:

''روپے کو ضائع کرنا گناہ ہے اور اگر روپیہ عوام کا ہو تو اور بھی گناہ ہے۔''

پاکستان بننے کے بعد ایوان صدر میں بھی اکثر غیر ضروری روشنیوں کو گل کرتے دیکھے گئے۔ اصفہانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''تحریک پاکستان کے سلسلے میں جو منی آرڈر آتے تھے ان کی دو آنے چار آنے والی رسیدوں پر بھی وہ خود دستخط کرتے تھے۔''

نیاز مندوں کے عرض کرنے پر کہ یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے چوں کہ اس میں ان کا قیمتی وقت صرف ہوتا ہے انہوں نے جواب دیا:

''بات رقم کی مقدار کی نہیں جذبے اور اصول کی ہے۔ جتنا جس کے پاس ہے وہ پاکستان کے لیے دے رہا ہے میں خود دستخط کر کے اس کے جذبے کی قدر کرنا چاہتا ہوں اور اس کو یقین دلانا چاہا ہوں کہ اس کا پیسہ پیسہ میرے علم میں ہے اور محفوظ ہے۔''

وہ قومی پیسے کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط تھے جو کارکن پیسے کے حساب رکھنے میں کوتاہی کرتا یا لاپرواہی سے صرف کرتا خواہ اس طرح نقصان زیادہ نہ بھی ہوا ہو۔ لیکن اس پر کسی اور معاملے میں اعتبار نہیں کرتے تھے قائداعظم محض کسی کو خوش کرنے کے لیے خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو یا محض عوام کو متاثر کرنے کے لیے نہ کچھ کہہ سکتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ ان کی دوستی اور دشمنی برملا ہوتی تھی اور اصول کی خاطر ہوتی تھی۔ نہ وہ بِک سکتے تھے ان کی سخت گیری ان کی انتہائی دیانت کا ایک ظاہری پہلو تھا۔ جب کبھی ان کی دیانت داری کی تعریف کی جاتی تھی تو وہ کہتے تھے میرے نزدیک بالکل فطری بات ہے۔ اصفہانی نے لکھا ہے ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ ان کے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت نہ تھا۔ کھانا، آرام، نیند سب کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

دور سے وہ ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند نظر آتے تھے۔ جذبات کے لیے ان کے پاس زیادہ وقت نہ تھا اصل میں ان کی حالت اس جان باز سپاہی کی سی تھی جسے میدان جنگ میں لڑنے کے سوا نہ کسی چیز کا ہوش ہوتا ہے نہ ضرورت ہوتی ہے قائداعظم پر اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو بزم، پاک دل و پاک باز

خوش مزاجی اور حاضر جوابی

بنیادی طور پر قائداعظم سنجیدہ دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کے مشاغل اور دلچسپیاں بھی سنجیدہ نوعیت کی تھیں۔ ان کے بارے میں عام تاثر بھی یہی ہے کہ وہ بے حد سنجیدہ اور متین انسان ہیں۔ سنجیدہ اور متین وہ ضرور تھے لیکن ان کی ہمہ گیر شخصیت کا پہلو یہ بھی تھا کہ مناسب اور موزوں موقعوں پر وہ وقار سے ہنستے بھی تھے۔ سلجھے ہوئے مذاق سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔ خود بھی کبھی کبھی دلچسپ واقعات اور لطیفے سناتے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی اور ممتاز حسن جنہیں قائداعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ فرخ امین جو آخری ایک برس ان کے پرائیویٹ سیکرٹری رہے تھے۔ ان سب نے قائداعظم کی خوش مزاجی کا تذکرہ کیا ہے۔ فرخ امین نے قائداعظم کا سنایا ہوا ایک لطیفہ بھی لکھا ہے:

''اگر وہ نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو'' پورا لطیفہ یوں ہے

کہ انگلستان کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی معمول سے
زیادہ دیر ٹھہر گئی ایک ہندوستانی جج نیچے اتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے
لگے اتنے میں ایک انگریز بھی گاڑی سے اترا اور سیدھا جج
صاحب کے پاس جا کر پوچھنے لگا گاڑی کب چلے گی۔ جج نے
کہا مجھے کیا معلوم۔ اس پر انگریز نے کہا تمہیں معلوم ہونا
چاہیے کیا تم اسٹیشن ماسٹر نہیں ہو، جج نے جھنجھلا کر جواب دیا:

"نہیں! میں اسٹیشن ماسٹر نہیں ہوں۔"

انگریز بولا:

"اگر نہیں ہو تو ویسے نظر کیوں آتے ہو؟"

ایک مرتبہ قائداعظم لاہور میں اپنے ایک عزیز دوست اور مقتدر لیگی رہنما ملک برکت علی کے ہاں شادی کی ایک تقریب میں شریک تھے۔ کھانے کے بعد جو فیرنی پیش کی گئی اس میں غلطی سے چینی کے بجائے نمک ملا ہوا تھا۔ جو مہمان فیرنی کا چمچہ منہ میں ڈالتا۔ منہ بناتا میزبان پریشان اور شرمندہ تھے۔ قائداعظم میزبان کے آڑے آئے فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور مہمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

"حضرات نمکین فیرنی پر متعجب نہ ہوں ملک صاحب آپ کو
اپنے گھر کا زیادہ سے زیادہ نمک کھلانا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان
کا نمک حلال کر سکیں۔"

لیکن ان کی ظرافت اور حاضر جوابی حریفوں کے لیے طنز کی تلوار بن جاتی تھی۔ایک دفعہ کسی مقدمے میں بحث لمبی ہوگئی۔قائداعظم کی عادت تھی کہ وہ تفصیل سے پورا تجزیہ کرتے تھے۔انگریز مجسٹریٹ جھنجلایا ہوا تھا چمک کر بولا:

''مسٹر جناح! میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سنتا ہوں دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔''

قائداعظم نے برجستہ جواب دیا:

''جناب والا! آپ کے دونوں کانوں کے درمیان کی جگہ غالباً خالی ہے۔''

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ قائداعظم ایک مقدمے میں بڑے اعتماد اور قدرے جارحانہ انداز سے اپنے دلائل پیش کررہے تھے۔انگریز مجسٹریٹ کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔بھڑک اٹھا۔تنبیہ کے لہجے میں بولا:

''مسٹر جناح! نہ بھولیے آپ کسی تھرڈ کلاس مجسٹریٹ سے مخاطب نہیں ہیں۔''

قائداعظم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

''جناب والا! آپ کے سامنے بھی کوئی تھرڈ کلاس وکیل بحث نہیں کررہا ہے۔''

ایک اور مقدمے میں ایک برخودغلط جج نے کہا:

''مسٹر جناح زور زور سے بولئے میں سن نہیں رہا۔''

قائداعظم نے کہا:

''غور سے سننا آپ کا کام ہے میں بیرسٹر ہوں ایکٹر نہیں ہوں۔''

لیکن قائداعظم کی اس حاضر جوابی اور طنز کے اصلی جوہر سیاسی میدان میں کھلتے تھے جب وہ اپنی برجستہ گوئی اور طنز کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کانگریسی لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی نے مہاتما کا روپ دھار رکھا تھا اور مہاتما گاندھی کے نام سے معروف تھے ان کے روحانی کمالات کا بھی ہندوؤں میں بڑا چرچا تھا یوں تو وہ تمام ہندوستانیوں کا لیڈر ہونے کا دم بھرتے تھے لیکن اندر سے خالص ہندو تھے اور ہندو مفادات کے کٹر محافظ۔ قائداعظم گاندھی کی منافقت کا حال جانتے تھے کہ یہ بھی سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ دونوں سیاست کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے اور دونوں میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ گاندھی کے کسی چیلے نے اخبارات کو خبر مہیا کی کہ کل شام مہاتما جی اپنے آشرم کی کٹیا میں پرارتھنا کر رہے تھے کہ باہر سے ایک بڑا سانپ کٹیا میں آ گیا۔ مہاتما جی نہ اس سے ڈرے نہ انہوں نے اس کی پرواہ کی۔ برابر پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد ایک دو دفعہ چکر لگائے اور جیسے چپکے سے کٹیا میں داخل ہوا تھا۔ اسی طرح خاموشی سے باہر چلا گیا۔ بس پھر کیا تھا کانگریسی

حلقوں، ہندو جاتی اور نیشنل پریس نے مہاتما گاندھی کی کرامت کے طور پر اس خبر کی خوب تشہیر کی۔ وقت بے وقت کوچہ و بازار میں، عام جلسوں اور نجی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

اس دوران ایک پریس کانفرنس میں اخبار نویسوں نے قائداعظم سے پوچھا:

''قائداعظم آپ نے سانپ اور گاندھی جی کی خبر اخبارات میں پڑھی ہے۔''

آپ نے فرمایا:

''ہاں پڑھی ہے۔''

صحافیوں نے سوال کیا:

''آپ کا کیا خیال ہے یہ حقیقت ہو سکتی ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے؟''

جواب ملا:

''ایسا ہونا ممکن ہے اور ہو سکتا ہے یہ بات صحیح ہو۔''

ایک من چلے رپورٹر نے پوچھ لیا:

''قائداعظم تو سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کیا توجیہہ کریں گے؟''

قائداعظم مسکرائے۔ آنکھوں میں ظرافت کی چمک پیدا ہوئی اور کہا:

''پیشہ وارانہ اخلاق کی بات ہے۔'' (زہریلے کیڑے اپنے جیسے جان دار

کو نہیں ڈسا کرتے)اس سیاسی طنز کا جواب نہیں جو لوگ گاندھی کی سیاسی چالوں سے واقف ہیں وہی اس کی داد دے سکتے ہیں۔ جون 1937ء میں قائداعظم پنجاب مسلم لیگ کا پارلیمانی بورڈ قائم کرنے لاہور تشریف لائے اس وقت مسلم لیگ بالکل منظم نہیں تھی اور صوبے پر یونینسٹ پارٹی چھائی ہوئی تھی۔ قائداعظم کی ٹرین رات کو پہنچی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا۔ جیسے ہی قائداعظم نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ سارے ریلوے اسٹیشن کی لائٹ آف ہوگئی اتفاقاً یا کسی کی شرارت تھی۔ مجلس استقبالیہ کے اراکین گھبرا گئے۔ قائداعظم نے اپنی گرج دار آواز میں برجستہ فرمایا:

''دیکھا لاہور میں میرے قدم رکھتے ہی یونینسٹ پارٹی کا چراغ گل ہوگیا۔''

5 اگست 1947 کو دہلی سے کراچی روانہ ہونے سے پہلے قائداعظم نے جو پریس کانفرنس بلائی تھی اس میں ہندو صحافی مخالفانہ انداز سے سوال و جواب کر رہے تھے ایک نے پوچھا: ''پاکستان کیا مذہبی ریاست ہوگی؟'' قائداعظم نے جوابی سوال کیا: ''مذہبی ریاست کا کیا مطلب؟ بغیر سوچے سوال نہیں کرنا چاہیے'' اس پر ایک تیز صحافی نے اپنے خیال میں تیر مارا ''اس کا مطلب ہے ملاؤں کی حکومت۔'' قائداعظم نے برجستہ جواب دیا ''پنڈتوں کی حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' (اشارہ پنڈت نہرو کی طرف تھا) اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

1946ء میں قائداعظم اہم سیاسی مذاکرات کے لیے لندن تشریف لے

گئے قائداعظم پر سب کی نظریں لگی ہوئی تھیں لیکن وہ قبل از وقت کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے جہاز سے اترتے ہی اخبار لندن ٹائمز کے رپورٹر نے گھیرا۔ ''جناب آپ کیا پیغام لائے ہیں۔'' مقصد یہ تھا کہ قائداعظم کے رویے کا کچھ کھوج لگایا جائے۔ اس روز اتفاق سے لندن کا مطلع صاف تھا۔ قائداعظم نے کہا فوراً جواب دیا:

''میں آپ کے لیے خوشگوار موسم لایا ہوں۔''

پھر جائے قیام پر روانہ ہونے سے پہلے کار کے پاس ذرا کے ذرا ٹھہرے پیچھے مڑ کر دیکھا اخباری نمائندے بیان لینے جھپٹے۔ قائداعظم نے مسکرا کر فرمایا:

''دوستو! آج جو بیان مجھے دینا ہے وہ یہی ہے کہ فی الحال میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔''

یہ کہہ کر کار میں سوار گئے۔ قائداعظم کی حاضر جوابی اور نکتہ سنجی کا ایک واقعہ سردار عبدالرب نشتر نے لکھا ہے۔ ایک میٹنگ میں پاکستان کا پرچم زیر بحث تھا۔ قائداعظم نے فرمایا کہ یہ بہتر نہ ہوگا کہ پاکستان کے پانچ صوبوں کی نمائندگی کے لیے پرچم میں پانچ ستارے رکھے جائیں۔ اس کے جواب میں سردار نشتر نے کہا پاکستان کے ساتھ ریاستوں کے الحاق اور کئی وجوہ سے صوبوں کی تعداد میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ اس صورت میں ستاروں کی تعداد بدلنا ہوگی اور نہ بدلی تو پانچ ستارے بے معنی ہو جائیں گے۔ اس پر قائداعظم نے مسکرا کر فرمایا۔ ایسی صورت میں ہم پانچ ستاروں کی توجیہہ کریں گے کہ ان سے مراد پنجتن ہے۔ قائداعظم کا یہ

جواب ان کی حاضر جوابی کی مثال بھی ہے اور نکتہ سنجی کی بھی اس سے ان کی، ان کے لاشعوری ذہن کے مذہبی رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے۔

قائداعظم کی ازدواجی زندگی

ہر بڑے آدمی کے بارے میں تجسس ہوتا ہے دنیا کے اسٹیج پہ جیسا کچھ ہے، وہ تو ہے۔ اسٹیج کے پیچھے وہ کیسا ہے۔ اس کی گھریلو زندگی کیسی ہے بیوی بچوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے اس کی نجی اور جذباتی زندگی کا رنگ کیا ہے۔ قائداعظم کے بارے میں بھی یہی تجسس ہے اور شدت سے ہے۔ چوں کہ اس سلسلے میں معلومات کم ہیں۔ اس لیے حقیقت کے ساتھ کچھ افسانے بھی مشہور ہو گئے ہیں۔

اب تک اس بارے میں جو کچھ تحقیق ہوئی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ قائداعظم نے زندگی میں دو بار شادی کی ان کی پہلی شادی 16 سال کی عمر میں لندن جانے سے ایک سال پہلے طالب علمی کے زمانے میں 1892ء میں بمبئی کے مشہور تاجر لیرا کھیم کی بیٹی ایمی یا امر بائی سے ہوئی تھی۔ بہت دھوم دھام سے بارات کراچی سے ہریانہ جام نگر کاٹھیاواڑ گئی تھی اور شادی کی رسومات روایتی طریقے سے سرانجام پائی تھیں۔ کم عمری کی شادی ان کی ماں کے اصرار سے ہوئی تھی۔ جوان کے لندن جانے سے پہلے ان کے سہرے کے پھول دیکھنا چاہتی تھیں۔

شادی کے تقریباً ایک سال بعد جنوری 1893ء میں وہ کاروباری سلسلے میں لندن چلے گئے۔ واہاں پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کردی۔ ایک روایت کے مطابق ایمی بائی کا انتقال 1893ء میں ہوگیا دوسری روایت یہ ہے کہ وہ 1897ء میں بمبئی میں ایک وبا میں اللہ کو پیاری ہوئیں، ایمی بائی سے شادی ان کی شادی ایک رسمی کاروائی تھی۔ اصل میں اس وقت دونوں بہت چھوٹے تھے۔

محمد علی جناح کی دوسری شادی 19 اپریل 1918ء کو بمبئی میں رتن بائی سے ہوئی۔ دیکھا جائے تو یہ ان کی اصل شادی تھی۔ رتی بمبئی کے مشہور پارسی رہنما سرڈنشا پٹیٹ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ وہ 20 فروری 1900 کو پیدا ہوئیں۔ ان کی پرورش بڑے شاعرانہ ماحول میں ہوئی۔ رتی کی گیارہویں سالگرہ پر سرڈنشا نے اپنی بیٹی کو مشہور انگریزی شاعر ٹینی سن کی نظموں کا مجموعہ تحفے میں دیا تھا۔ رتی کو ناول، ڈرامے اور سارے ادب کے مطالعہ کا شوق تھا خاص طور پر وہ انگریزی رومانی شاعری کی دلدادہ تھیں۔

جب 16 سال کی عمر میں وہ محمد علی جناح سے ملیں تو انگریزی کے رومانوی شاعروں جیسے شیلے، کیسٹن اور بائرن کو اچھی طرح پڑھ چکی تھیں اور اسی شاعرانہ رومانی موڈ میں تھیں۔ نفیس، روشن دماغ اور شاندار جناح ان کے لیے ایک رومانی ہیرو سے کم نہیں تھے پھر ان کی ملاقات بھی رومانی ماحول میں ہوئی۔ سرڈنشا اور لیڈی دین بائی ڈنشا دونوں محمد علی جناح کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ ان کی قابلیت،

شخصیت کے بھی اور قوم پرستانہ خیالات کے بھی۔ جناح گرمیوں کی چھٹیاں سرڈنشا کی دعوت پر ان کے ساتھ بنگال کے مشہور پہاڑی مقام دارجلنگ پر گذار رہے تھے۔ دارجلنگ کی رومانی فضا میں ان کی ملاقات ہوئی دونوں کی شخصیت میں کچھ باتیں مشترک تھیں۔

مثلاً ذہانت اور فراست کے ساتھ دونوں ایک انفرادیت رکھتے تھے دونوں انسان دوست تھے سوشل ورک کے دلدادہ تھے اور سیاست میں لبرل خیالات رکھتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ شخصیت کا حسن تھا۔ جس نے ایک کو دوسرے کی طرف کھینچا۔ ظاہری حسن میں دونوں کے لیے کوئی کمی نہیں تھی۔ جناح اس وقت چالیس کے ہو رہے تھے اگر چاہتے تو بہت پہلے شادی کر چکے ہوتے۔ رتی کی عمر 16 برس سے کچھ ہی زائد تھی جناح وجیہہ وشکیل ضرور تھے لیکن کشش کی اصل وجہ وجاہت و جمال نہیں شخصیت کا جلال و جمال تھا۔

ایک دوسرے کو پسند کرنے کے بعد جناح نے سرڈنشا سے جس طرح شادی کا ذکر چھیڑا وہ ان کی منطقی طبیعت کی عجیب مثال ہے۔ انہوں نے سرڈنشا سے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ دو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں شادی بیاہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ سرڈنشا نے پرزور طریقے سے ایسی شادیوں کی حمایت کی اور کہنے لگے:

"قومی اتحاد حاصل کرنے کے لیے یہ ایک موثر ذریعہ ہے

بہت اچھی بات ہے ضرور ہونا چاہیے۔"

یہ سن کر جناح نے سنجیدگی سے کہا:

"تو اجازت دیجئے۔ میں آپ کی بیٹی رتی بائی سے شادی کرنے لگا ہوں۔"

سرڈنشا سناٹے میں آگئے۔ ان کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اپنی رائے ان کے یوں گلے پڑے گی۔ سرڈنشا بڑے تعلیم یافتہ اور آزاد خیال پارسی تھے اور جناح کے خیالات اور شخصیت کے بڑے مداح، پھر بھی وہ اس رشتے پر تیار نہیں ہوئے جب رتی نے اصرار کیا تو انہوں نے قانون کا سہارا لیا قانوناً رتی 18 سال کی عمر سے پہلے اپنے والدین کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرسکتی تھیں۔ انہوں نے عدالت سے حکم امتناعی حاصل کرلیا۔ رتی بے چین تھیں لیکن جناح تو جناح تھے انہوں نے کہا:

"قانون سرڈنشا کے ساتھ ہے قانون کا احترام ضروری ہے ہمیں دوسال انتظار کرنا چاہیے۔"

چنانچہ دوسال تک دونوں ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ جناح نے اپنے وعدے کا پورا پاس کیا اور معاہدے کی پوری پابندی کی۔ رتی بائی کو پورا موقع دیا کہ وہ اپنے ارادے کو بدلنا چاہیں تو بدل دیں۔ محبت کو عقل واصول کے تابع رکھنا ناممکن نہیں مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن جناح نے اس مشکل کو بھی آسان کیا۔

رتی بھی ذہن کی پکی تھیں، یہاں بھی اصول کی بات تھی، 18 برس کے ہوتے ہی انہوں نے والدین کو بتا دیا کہ میں اب بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں 18 اپریل 1918ء کو انہوں نے جامع مسجد بمبئی میں جا کر بارضاو رغبت اسلام قبول کر لیا ان کا اسلامی نام رتن بائی قرار پایا۔ بمبئی میں 19 اپریل کو ان کا نکاح قائداعظم سے اسلامی طریقے کے مطابق ایک اثنا عشری قاضی نے پڑھایا۔ شیخ نجفی اور میرزا محمد علی مہاراجہ آف محمود آباد، قائداعظم کی طرف سے گواہ تھے رتن بائی کی طرف سے شریف دیوجی اور غلام علی گواہ تھے۔ مہر 1001 روپے تھا رونمائی یا نذرانے کے سوا لاکھ روپے۔ ہنی مون کا زمانہ انہوں نے یوپی کے مشہور پہاڑی مقام نینی تال میں گزارا تھا۔ رتن بائی جناح کی خلوت وجلوت کی ساتھی تھیں۔ ان کی سماجی ہی نہیں ان کی سیاسی مصروفیات میں بھی ان کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں لارڈ ولنگڈن بمبئی کا برخود غلط اور بدترین سامراجی ذہنیت کا گورنر تھا اس نے 1915ء میں بمبئی میں لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس نہیں ہونے دیا تھا۔

1918ء میں گورنمنٹ ہاؤس کی ایک دعوت میں لیڈی ولنگڈن نے مسز جناح رتن بائی کے ساتھ بے ادبی کا رویہ روا رکھا تھا اور جناح اپنی بیگم کے ساتھ احتجاجاً دعوت سے اُٹھ کر چلے آئے تھے جب اسی ولنگڈن کو کارپوریشن نے شہریوں کی طرف سے 10 دسمبر 1918 کو الوداعی سپاسنامہ پیش کرنے کی تجویز پیش کی تو جناح نے دوسرے قوم پرستوں کے ساتھ اس تجویز کی زبردست مخالفت کی۔ ٹاؤن

ہال پر قبضہ کر لیا۔ پولیس سے اچھی خاصی مڈبھیڑ ہوئی اس ہنگامے میں رتن بائی بڑی جرات سے اپنے دلیر شوہر کے ساتھ ساتھ رہیں۔ یہاں تک کہ پولیس سے تصادم میں دونوں کے خراشیں بھی آئیں۔

رتن بائی جرأت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور حاضر دماغی میں بھی کم نہیں تھیں جناح امپریل کونسل کے رکن کی حیثیت سے دلی آئے تھے۔ مسز رتی جناح ان کے ساتھ تھیں۔ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے دونوں کو دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ رات کے کھانے پر دعوت دی۔ اس زمانے کے آداب کے مطابق اے ڈی سی نے وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ کے آنے کا اعلان کیا تو مہمان تعظیماً کھڑے ہو گئے ہر مہمان اٹھ کر میزبان تک جاتا اور اس کا تعارف کرایا جاتا اور تمام خواتین رواج کے مطابق باری باری لیڈی چیمسفورڈ کے سامنے تعظیم کے طور پر سرخم کرتیں۔

جب مسز جناح نے مسلم خواتین کی طرح لیڈی چیمسفورڈ کی خدمت میں آداب عرض کیا تو اے ڈی سی دم بخود رہ گیا۔ وائسرائے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ لیکن اس وقت درگذر کر گیا کھانے کے بعد گفتگو کا دور شروع ہوا تو وائسرائے نے مسز رتی جناح سے کہا آپ کے شوہر کا مستقبل بہت شاندار ہے آپ کو ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ آپ نے قصر وائسرائے کے آداب کے مطابق ہماری تعظیم نہیں کی۔ روم میں روم کے آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ مسٹر جناح اس انداز

گفتگو سے قطعاً متاثر نہیں ہوئیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے وائسرائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ یور ایکسی لینسی میں نے جملہ آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔

آپ ہندوستان میں ہیں اور میں نے ایک ہندوستانی خاتون کی طرح آپ کو تعظیم دی ہے۔ مسز جناح کا جواب ان کے اور ان کے شوہر جناح کے شایان شان تھا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف جناح سخت احتجاج کر کے کونسل سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ حکومت انہیں بائیں بازو کے انتہا پسندوں میں شمار کرتی تھی۔ جو ہوم رول سے کم کوئی چیز قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ جب تحریک عدم تعاون سے انہوں نے تعاون نہیں کیا۔ تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی کہ کسی طرح انہیں رام کیا جائے۔

لارڈ چیمسفورڈ کے برخلاف وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ، جناح کے بڑے مداح تھے۔ ان کی ذات کے بھی اور ان کی صفات کے بھی، لارڈ ریڈنگ نے ترغیب دی کہ وہ ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ قبول کر لیں' اس کے بعد وائسرائے کی کابینہ میں لاممبر کی حیثیت سے تقرر کی پیش کش کی۔ جناح نے دونوں پیشکشیں مسترد کر دیں۔ آخر کار سر کے خطاب کا جال بھی ڈالا۔ جناح نے جواب دیا:

''سر محمد علی جناح کے مقابلے میں' میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے صرف مسٹر محمد علی جناح کہا جائے''

مسٹر جناح سے مایوس ہو کر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح کو زیر دام لانا چاہا۔ایک تقریب کے موقع پر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح سے پوچھا کیا وہ پسند نہیں کریں گے کہ لوگ انہیں لیڈی جناح کہیں ؟مسز جناح نے بے ساختہ جواب دیا جناح نے سر کا خطاب قبول کرلیا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گی۔خودداری اور قومی حمیت میں وہ اپنے عظیم المرتبت شوہر سے کم تر نہیں تھیں۔اسی طرح وطن پرستی اور جرأتِ اظہار میں بھی مسز جناح کا جواب نہیں تھا۔

ایک اور موقع پر کھانے کی دعوت میں وہ لارڈ ریڈنگ کے پاس بیٹھی تھیں۔لارڈ ریڈنگ نے اپنے زندگی کے واقعات سناتے سناتے جنگ سے پہلے جرمنی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے واقعات کا تذکرہ کیا اور کہا کہ یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اب میں خواہش کے باجود جرمنی نہیں جاسکتا۔مسز جناح نے پوچھا ''آخر کیوں نہیں۔ یور ایکسی لینسی ؟'' وائسرائے نے جوب دیا بات یہ ہے کہ جرمنی ہم انگریزوں کو خاص طور پر جنگ کے بعد پسند نہیں کریں گے یہ سن کر مسز جناح برجستہ کہا تو ''پھر یور ایکسی لینسی آپ ہندوستان کیسے آگئے۔'' یہ ان کی شخصیت کا جلالی پہلو تھا۔ ہمدردی وغم گساری سے بھی ان کا دل لبریز تھا۔ جی الانہ نے اپنی کتاب قائداعظم محمد علی جناح میں ان کی نرم دلی اور انسانی ہمدردی کی مثالیں دی ہیں۔

4 مئی 1919ء میں جب جناح ایک سیاسی مہم پر لندن گئے تو رتن بائی بھی ان کے ساتھ تھیں۔14 اگست 1919ء کو لندن میں ان کی کلوتی بیٹی دنیا پیدا ہوئیں۔

باقی لندن کے قیام کے زمانے میں رتن بائی کی خط و کتابت گاندھی اور کانجی دوارکا داس سے تھی اس سے ان کی سیاسی حیثیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اکتوبر 1920ء میں کانگریس کے ناگپور کے اجلاس میں جناح نے گاندھی اور کانگریس سے کھل کر اختلاف کیا اس موقع پر بھی رتن بائی جناح کو ساتھ تھیں۔ رتن بائی کے حسن، خوش لباسی، بیش قیمت زیورات، ذہانت اور خوداعتمادی کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کی بیویاں ان سے حسد کرتی تھیں۔ لیڈی ولنگڈن کا واقعہ اوپر گزرا۔

1931ء کے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے ان سے مل کر جو خطوط لندن لکھے ہیں اُن میں ان کی خوبصورتی' خوش ادائی' خوش لباسی اور خوداعتمادی کا بار بار تذکرہ کیا ہے خوبصورتی' خوش ادائی' خوش لباسی، رتن بائی کی شخصیت کا صرف ظاہری پہلو تھا۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے بمبئی کا گلاب کہلاتی تھیں۔ اندر سے ان کی شخصیت بہت پہلو دار تھی۔ شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ مطالعے کی بے حد شوقین تھیں۔

1920ء سے بعد کے زمانے میں روحانیات اور علم النجوم سے انہیں گہری دلچسپی ہوگئی تھی۔ خود بھی بہت سے جانور پال رکھے تھے بیمار اور معذور پالتوں جانوروں کی دیکھ بھال میں بہت دلچسپی لیتی تھیں اور ایسے اداروں سے بھی تعاون کرتی تھیں۔ کانجی دوارکا داس بمبئی کے ایک مشہور سوشل ورکر تھے۔ ان کے کام میں جناح اور مسز جناح دونوں عملی دلچسپی لیتے تھے۔

1918ء سے 1928ء تک دس سال دونوں نے بحیثیت مجموعی، مثالی ہم آہنگی سے گزارے۔ اسمبلی، کورٹ، سیاسی پلیٹ فارم ہر جگہ دونوں ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات دونوں پہاڑی مقامات پر گزارتے تھے نارمل اختلافات تو ایک آدھ بار ان میں پہلے بھی ہوتے تھے لیکن جنوری 1928ء میں کچھ زیادہ ہی سرگرانی بڑھ گئی۔ اور رتی علیحدہ رہنے لگیں۔ 3 اپریل کو جناح انگلستان روانہ ہوئے ایک ہفتے کے بعد 10 اپریل کو رتی بائی بھی اپنی والدہ کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ پیرس میں شدید بیمار پڑ گئیں۔ ایک مشترکہ دوست کے توسط سے جناح کو ان کی بیماری کی اطلاع ہوئی اس وقت وہ ڈبلن میں تھے وہ بھاگم بھاگ پیرس پہنچے۔ کلینک میں رتی کی تیمارداری کی۔

علاج تبدیل کروایا وہ ایک ماہ تک نرسنگ ہوم میں ان کے ساتھ رہے بہت محبت اور شفقت سے ان کی تیمارداری کی وہ ان کے ساتھ ہی پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ یہ بات خود رتن بائی نے کانجی دوارکاداس کو خط میں لکھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اختلافات ختم نہ ہو سکے وہ علیحدہ علیحدہ ہندوستان واپس ہوئے رتی نے ماں کے ساتھ دوسرا جہاز لیا۔ لیکن جناح کی پرخلوص تیمارداری رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔

28 اکتوبر 1928ء کو رتی جناح نے مارسیلز سے جناح کو جذباتی خط لکھا جس میں انہیں اپنی شدید وابستگی کا یقین دلایا۔ اس کا یہ فقرہ "جو ٹریجڈی محبت سے

شروع ہوئی تھی ہونا چاہیے کہ وہ محبت پر ہی ختم ہو" بمبئی کے ایم سی چھاگلہ نے جو جناح اور رتی دونوں کو قریب سے جانتے تھے اور جناح کے سیاسی حریف تھے لکھا ہے جناح نے رتن بائی کے ساتھ ہمیشہ انتہائی مروّت اور محبت کا رویہ روا رکھا۔ اختلاف کے باوجود ان کی شاہانہ زندگی کے تمام مصارف خوشی سے برداشت کئے اور عزت واحترام کا سلوک کیا۔

جنوری 1929 میں رتن بائی پھر بیمار پڑ گئیں سرشام جناح آتے مزاج پرسی کرنے کا وقت ہوتا تو گھنٹوں باتیں کرتے۔ ماضی کی یادیں انہیں پھر قریب لا رہی تھیں کچھ مفاہمت ہو رہی تھی کہ 1929ء کے وسط میں مرکزی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں شرکت کرنے کے لیے جناح کو بادل نخواستہ دہلی جانا پڑا۔ رتی کی حالت بگڑتی چلی گئی۔

19 فروری کو وہ بے ہوش ہوگئیں۔ 20 فروری کو اپنی سالگرہ کے دن ان کا انتقال ہوگیا۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات شریف دیوجی نے اسلامی طریقے سے کیے انہیں آرام باغ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ جناح دفن کے وقت موجود تھے۔ انہیں قبر میں اُتارتے وقت رو پڑے۔ قبر پر مٹی بھی سب سے پہلے انہوں نے ہی ڈالی۔

جناح اور رتن بائی کے مشترکہ دوست اور رفیق کار، کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب "رتی جناح" میں جناح کو خراج تحسین ادا کیا ہے یہ شادی دل و دماغ

کے سنگم سے ہوئی تھی۔ دونوں ایک جان اور دو قالب تھے۔ رتی سے شادی کے بعد جناح نے اورینٹ کلب سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اور بیشتر وقت رتی کے ساتھ گزارتے تھے۔ رتی جب باہر ہوتی تھیں تو کانجی دوارکا داس سے جناح کی عافیت معلوم کرتی رہتی تھیں اور لکھتی تھیں کہ جناح عادتاً زیادہ کام کرتے ہیں انہیں اس سے باز رکھا جائے کم عمر رتی ایک معروف اور عظیم رہنما کی بیوی کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے خوب واقف تھیں اور انہیں خوب ادا کیا۔

قائداعظم کے بھائی بہن اور بیٹی

قائداعظم کی شخصیت اور کردار کے بعض پہلو ایسے ہیں جو ان کے بہن بھائیوں کے حوالے سے ہی اجاگر ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اس رخ پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

محمد علی جناح اپنے سات بہن بھائیوں میں سے سب سے بڑے تھے ان سے چھوٹی بہن تھیں، رحمت جو 1878ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ پھر بھائی بندے علی (پیدائش1880ء) ان کی پیٹھ پر ایک اور بہن مریم بی (پیدائش 1882ء) مریم کے بعد پھر ایک بھائی احمد علی (پیدائش 1886ء) احمد علی کے بعد دو بہنیں شیریں (پیدائش 1888ء) اور فاطمہ (پیدائش1896ء) فاطمہ سے چھوٹا ایک بھائی اور تھا جو پیدا ہونے کے بعد عقیقے سے پہلے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ صرف ''بچو'' کے عرف سے اسے پکارا گیا تھا۔

1896ء میں لندن سے واپس آنے کے چند سال بعد انہوں نے اپنے خاندان کی کفالت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ ان کے گھر والے بمبئی کے خوجے محلے میں رہتے تھے ان کی اپنی رہائش پہلے اپالو ہوٹل بمبئی میں رہی۔ پھر ساؤتھ کورٹ کے علاقے میں۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں سے برابر ملتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بہن رحمت کی شادی کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا وہ قابل ذکر ہے۔ رحمت بی کے لیے رشتے کی تلاش جاری تھی کہ کلکتے کے مشہور تاجر قاسم جمال کا پیغام آیا۔ یہ رشتہ ان کے والد جناح پونجا کو بھی پسند تھا۔ لیکن وہ مسلک کے فرق کی وجہ سے یہ رشتہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ قاسم جمال خوجے تو ضرور تھے لیکن سنی خوجے تھے۔ اس لیے برادری والے اس کے حق میں نہیں تھے۔ محمد علی جناح نے کہا:

"دیکھنا یہ چاہیے کہ رشتہ موزوں ہے یا نہیں۔ سنی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

بڑھتے بڑھتے بات آغا خان تک پہنچی۔ محمد علی جناح نے آغا خان سے مل کر اپنے والد کو اطمینان دلایا کہ آغا خان کی ہدایت پر برادری والے اعتراض نہیں کریں گے۔ چنانچہ محمد علی جناح کے اہتمام سے رحمت کی شادی کلکتے کے سنی خوجے قاسم جمال سے ہوگئی۔ اس وقعہ سے نہ صرف محمد علی جناح کی وسیع المشربی اور بے تعصبی پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ اس خصوصیت پر بھی کہ وہ ذاتی معاملات میں بھی اصول اور معقولیت کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کی دوسری بہن مریم کی بھی شادی انہی

کے ایماء سے بمبئی کے سنی خوجے تاجر عابدین پیر بھائی سے ہوئی۔

برادری سے باہر سنی خوجوں میں بیٹیوں کی شادی کرنے کے باعث ان کے تعلقات ننھیال والوں سے بھی ختم ہوگئے لیکن انہوں نے اصول کی خاطر اس کی بھی پرواہ نہیں کی۔ محمد علی جناح کو اپنی سب سے چھوٹی بہن فاطمہ سے شروع ہی سے زیادہ محبت تھی۔ وہ انہیں انگریزی اسکول میں تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ خاندان اور برادری کے لیے یہ ایک نئی بات تھی۔ بڑی مخالفت ہوئی لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے آخر انہوں نے فاطمہ کو بمبئی کے مضافات میں باندرہ کے کانونٹ اسکول میں داخل کرادیا۔

اتوار کے اتوار وہ گھوڑے پر سوار ہوکر فاطمہ کو دیکھنے جاتے تھے۔ یوں تو بمبئی میں اپنے سارے خاندان کے کفیل تھے۔ لیکن فاطمہ پر ان کی خصوصی توجہ تھی۔ جب فاطمہ نے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کرلیا تو محمد علی جناح نے انہیں کلکتے کے ایک ڈینٹل اسکول میں تعلیم کے لیے بھیج دیا۔ وہاں سے انہوں نے ڈینٹسٹری میں ڈپلومہ لیا۔ کچھ دنوں بمبئی میں پریکٹس بھی کی۔ لیکن رتن بائی کی علیحدگی کے بعد سے وہ مالا بارہل ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر واقع ان کی کوٹھی پر ان کے ساتھ رہنے لگیں۔ انہوں نے بہت شفقت اور محبت سے بڑے بھائی کی دیکھ بھال کی۔ وہ ان کی ہمدم و جلیس تھیں دوست اور غمگسار بھی۔ بعد کو ان کی سیاسی مشیر بھی۔ وہ آخر وقت تک ان کے ساتھ رہیں۔ وہ قائداعظم کو عموماً ''میرا بھائی'' (My Brother) کہتی تھیں اور پیار

سے (''جناح'' کو مختصر کر کے) ''جن'' کہتی تھیں۔ قائداعظم ان کی خدمات کا اعتراف بڑی محبت اور خلوص سے کرتے تھے۔ جولائی 1968ء میں اپنی وفات تک انہوں نے قوم کی رہبری اور راہ نمائی جاری رکھی۔ بھائیوں میں سے بندے علی بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ سب سے چھوٹے بھائی احمد علی نے بمبئی میں گمنامی کی زندگی بسر کی۔ بہنوں میں فاطمہ جناح کے انتقال کے بعد شیریں جناح بھی وفات پا چکی ہیں۔

بیٹی

قائداعظم کی اکلوتی بیٹی دینا جو 14 اگست 1919 کو لندن میں پیدا ہوئی تھیں۔ جب وہ دونوں لندن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دینا، مالا بار ہل کی کوٹھی میں ان کے ساتھ رہتی تھیں۔ جب بڑی ہوئیں تو انہیں لندن کے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جب کبھی قائداعظم لندن میں ہوتے تو وہ اور مس جناح دونوں دینا سے ملنے اسکول جاتے تھے۔ تعطیل وہ ان کے ساتھ گزارتی تھیں۔ دینا کے ننھیال پارسی تھے۔ ان کا وہاں آنا جانا بھی تھا ان کے اثر سے دینا نے ایک پارسی نوجوان نیول واڈیا سے شادی کر لی تو قائداعظم نے ناراض ہو کر دینا کو عاق کر دیا تھا لیکن ان سے انسانی تعلقات ختم نہیں کیے۔

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ اور طلبہ

بحیثیت قوم کے قائداعظم کو خوب معلوم تھا کہ قوم کے کس حصے سے کیا کام لینا ہے۔اور کیسے لینا ہے۔ 1937ء کے الیکشن کے جیتتے جیتتے ہی مسلم لیگ کی سیاسی جدوجہد ایک فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی قائدعظم نے علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی اور ملک کے دوسرے حصوں کے مسلم طلبہ کو تحریک پاکستان سے روشناس کیا اور انہیں پاکستان کے حصول کی جدو جہد کے لیے تیار کرنا شروع کیا تحریک پاکستان کو ولولے' جوش' قربانی اور ایثار کے ساتھ نئے ذہن، نئی فکر کی ضرورت بھی تھی۔ تا کہ تحریک پاکستان کے مقاصد کی روشنی گھر گھر پہنچ جائے۔نو جوان طلبہ ہی اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے تھے۔

چنانچہ قائداعظم نے طلبہ کو تحریک پاکستان کا ہراول دستہ بنایا۔لیکن طلبہ کی قوت کو کام میں لانا کوئی سستا سیاسی کرتب نہ تھا۔قائداعظم سستی سیاست کے حربے

استعمال کر ہی نہیں سکتے تھے۔وہ اعلیٰ مقصد کو اعلیٰ طریقوں سے حاصل کرنے کے قائل تھے۔انہوں نے طلبہ کے جوش وخروش، ولولے اور ایثار کے جذبے ہی سے کام نہیں بلکہ ان کی ذہنی اور جذباتی تربیت بھی کی۔انہیں ان کی تعلیمی ذمہ داریوں سے آگاہ بھی کیا نظم وضبط کا پابند ہونے کی تلقین بھی کی۔انہیں نوجوان طلبہ پر اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے فرمایا:

''مجھے اُمید ہے کہ تم میں سے بہت سے جناح پیدا ہوں گے۔ مجھے مستقبل سے کوئی اندیشہ نہیں اگر یہ تمہارے ہاتھ میں ہو۔''

لیکن جناح بننا کوئی آسان کام نہیں تھا۔اس مشکل کام کو آسان کرنے کی راہیں بھی انہوں نے خود ہی بتائیں۔مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے وفد سے آپ نے فرمایا:

''آپ مستقبل کے معمارِ قوم ہیں۔اس لیے جو مشکل کام آپ کے سر پر کھڑا ہے اس سے نمٹنے کے لیے اپنی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کیجیے۔مناسب تعلیم اور مناسب تربیت حاصل کیجیے۔ آپ کو پورا پورا احساس ہونا چاہیے کہ آپ کی ذمہ داریاں کتنی زیادہ اور شدید ہیں۔ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے آپ کو ہر وقت تیار اور مستعد رہنا چاہیے۔''

مصروفِ عمل ہونے کی تاکید

''میں آپ کو مصروف عمل ہونے کی تاکید کرتا ہوں کام، کام اور بس کام۔ پر سکون طریقے سے صبر و برداشت اور انکساری کے ساتھ اپنی قوم کی سچی خدمت کرتے جایئے۔''

(آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس، 15 نومبر 1946ء جالندھر)

اسی بیان میں آپ نے مسلم طلبہ کو روشن ضمیر اور دانائے راز ہونے کی ضرورت سے بھی آگاہ کیا۔ واضح رہے کہ یہ زمانہ آغازِ تحریک پاکستان کا تھا۔ آپ نے فرمایا:

''جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوششوں کو محض تیاری تک محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ تمام ہندوستان کے مسلم طلبہ کو منظم کریں تاکہ مسلمانانِ ہند کے حقوق کی پوری حفاظت ہو سکے۔ آپ کو چاہیے کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی حقوق، تعلیمی نشو ونما اور ترقی کے لیے ایک لائحہ عمل بنائیں اور اسے عملی جامہ پہنائیں۔ آپ کا یہ فرض بھی ہے کہ آپ اسلامی تہذیب کو فروغ دیں میں نے ابھی کہا ہے آپ عملی سیاست

میں حصہ نہ لیں میں اس امر کی بھی وضاحت کرنا چاہتا ہوں ۔ اس سے میرا اصل مطلب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالب علمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔ آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار کریں اور ضروری سازوسامان یعنی علم وآگہی اور توفیق عمل سے آراستہ کریں۔ آپ کی اوّلین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ، مطالعہ، مطالعہ، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان طلبہ اور عام طور پر مسلمانوں میں عظیم الشان بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ ترقی کی ضرورت کا احساس موجود ہے جوش وخروش ہے ولولہ ہے لیکن ساتھ ہی جذباتی نعرے بھی سنائی دیتے ہیں۔ آپ اسی صورت میں دوسروں کے عقیدے بدل سکتے ہے کہ پہلے آپ خود روشن ضمیر بن جائیں۔ آج کل دانائے راز کی خصوصی ضرورت ہے کہ گمراہ کن باتیں زور وشور سے کی جارہی ہیں۔''

تعلیم پہلا فرض

''آپ تعلیم پر پورا دھیان دیں۔ اپنے آپ کو عمل کے لیے تیار

کریں۔ یہ آپ کا پہلا فریضہ۔ آپ کی تعلیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ آپ دور حاضر کی سیاست کا مطالعہ کریں یہ دیکھیں کہ آپ کے گرد دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔"

(کراچی 26 ستمبر 1947ء)

لیکن پاکستانی طلبہ کے لیے صرف علم کافی نہیں تھا۔ کردار، عزم حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"میں پاکستان کے ہر باشندے اور بالخصوص نوجوان طلبہ کو یہ بات اچھی طرح بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ خدمت، ہمت اور برداشت کے سچے جذبے کا مظاہرہ کریں۔ بلند کرداری کی ایسی مثالیں قائم کریں کہ آپ کے ہم عصر اور آنے والی نسلیں آپ کی تقلید کریں۔"

قائداعظم کی نظر میں طالب علم کا کام علم کی طلب و جستجو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو جہاد کے لیے تیار کرنا بھی ہے آپ نے اسی خطاب میں طلبہ کو یہ تلقین بھی کی:

"اپنے حوصلوں کو ہر صورت میں بلند رکھیے۔ موت سے نہ ڈریے ہمارا مذہب یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اسلام اور پاکستان کی عزت بچانے کے لیے ہمیں

موت کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ مسلمان کے لیے اس
سے بہتر اور کوئی وسیلہ نجات نہیں ہوسکتا کہ وہ صداقت کی خاطر
شہید کی موت مر جائے۔"

بچوں کا بابا

بڑے آدمیوں کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر غیر معمولی شفقت کرتے ہیں۔ وہ قائداعظم جو رزم حق و باطل میں فولاد تھے جن سے بڑے بڑے جابر خم کھاتے تھے۔ وہ بچوں کے لیے ریشم سے بھی زیادہ نرم تھے۔ ایک بار کوئٹہ میں لوگوں نے یہ منظر دیکھا کہ ایک کھلونوں کی دُکان کے سامنے ایک بڑی چم چم کرتی کار آ کر رکی۔ ایک طویل القامت، خوش لباس، وجیہہ اور شاندار شخص کار سے باہر آیا اور کھلونوں کی دُکان میں داخل ہو گیا۔ بعض نے پہچان لیا اور قائداعظم زندہ باد کا نعرہ لگایا۔

وہ قائداعظم کی ایک جھلک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ کھلونوں کی دکان پر قائداعظم کیا کر رہے ہیں۔ حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کا قائداعظم بچوں، بالوں کا بڑا بابا بھی تھا۔ وہ کوئٹہ میں جس خاندان کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے اس گھر کا ایک چھوٹا بچہ ان سے بہت مانوس ہو گیا وہ انہیں دادا کہہ کر پکارتا اور اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود ان دادا کے

کمرے میں اکثر دوڑ آتا۔ قائداعظم اس کو زانو پر بٹھا لیتے اور اس کی پیاری پیاری باتوں سے جی بہلاتے۔ وہ اس کے ساتھ بچوں کے کھیل کھیل لیتے۔ اپنی بے پناہ مصروفیت سے وقت نکال کر وہ کھلونوں کی دکان میں اس بچے کے لیے کلدار گھوڑا خریدنے گئے تھے۔ بچوں سے ان کی دلچسپی محض اس لیے نہیں تھی کہ پیاری پیاری باتوں اور معصوم شرارتوں سے ان کا جی بہلاتے تھے۔

بچوں سے ان کی محبت اور شفقت ذاتی نہیں تھی۔ بچے ان کی نظر میں مستقبل کے معمار تھے۔ قوم کی آئندہ اُمیدیں ان سے وابستہ تھیں۔ اس لیے جب بھی، جہاں بھی موقع ملتا وہ بچوں اور نوجوانوں پر نظر کرم فرماتے۔ ایک بار ان کا جلوس ایک شہر کے بازار سے گزر رہا تھا۔ کسی چھت کے اوپر دو چھوٹے بہن بھائیوں نے انہیں پہچان لیا اور چیخ پڑے ''قائداعظم'' ......

قائداعظم کی نظریں ان کی طرف اٹھیں اور وہ انہیں دیکھ کر مسکرائے' بچوں کے پاس دو نارنگیاں تھیں۔ وہی انہوں نے عقیدتاً پھینک دیں۔ کھلی کار میں نارنگیاں آکر گریں۔ قائداعظم نے انہیں اٹھا لیا اور اپنے ننھے عقیدت مندوں کی نشانی کو دیر تک اپنے ہاتھوں میں رکھا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے ایک بار قائداعظم نے ایک گاؤں سے گزرتے ہوئے کار روکی تو بہت سے دیہاتی جمع ہوگئے اور بار بار ''قائداعظم زندہ باد'' اور ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے بلند ہونے لگے اور بعض دوڑ کر ہار پہنانے لگے۔

قائداعظم نے دیکھا کہ ایک دس برس کا لڑکا بہت بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہا ہے اور بہت جوش میں ہے' قائداعظم نے اسے پیار سے کہا بلایا اور پوچھا میرے بچے پاکستان زندہ باد کا مطلب کیا ہے؟ اس نے کہا جناب زیادہ تو آپ جانتے ہوں گے۔ مجھے تو اتنا معلوم ہے جہاں مسلمان زیادہ ہیں مسلمان حکومت کریں اور جہاں ہندو زیادہ ہیں وہاں ان کی حکومت ہو' قائداعظم نے بچے کی پیٹھ تھپتھپائی اور بہت خوش ہوئے۔ بعد کو اکثر اس واقعہ کا ذکر کرتے اور کہتے تھے۔ ہمارے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع نہیں ہیں۔ لیکن پاکستان کی آواز گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے۔

ایک بار گیارہ برس کی ایک بچی نے انہیں رومال پر پاکستان کا نقشہ کاڑھ کر بھیجا۔ قائداعظم اس تحفے سے بہت خوش ہوئے۔ بعد کو یہ رومال انہوں نے وائسرائے کو دکھایا۔ اور کہا پاکستان کو اب کون روک سکتا ہے۔ پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا اور لیگ نے چندے کی اپیل کی تو ہزاروں، لاکھوں بچوں نے اپنے جیب خرچ، اپنی عیدیاں اور اپنے سالگرہ کے انعام قائداعظم کو منی آرڈر کیے۔ قائداعظم اپنے ہاتھ سے ''ایم اے جناح'' رسید پر لکھتے تھے اور بچے یہ رسیدیں اپنی آنکھوں سے لگاتے اور اپنی تمام چیزوں سے زیادہ عزیز رکھتے۔

ذاتی کوائف

عقیدہ

محمد علی جناح آبائی طور پر اسماعیلی خوجے تھے۔ ابوالحسن اصفہانی کی روایت کے مطابق 21 برس کی عمر میں انہوں نے اثنا عشری مسلک اختیار کر لیا تھا لیکن عملی طور پر وہ وسیع المشرب مسلمان تھے۔ کسی عقیدے سے تعصب نہ تھا۔ عام مسجدوں میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ فاطمہ جناح کا مسلک بھی یہی تھا انہوں نے ایک مجتہد سے فرمایا نہ میں شیعہ ہوں، نہ میں سنی میں صرف مسلمان ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صرف اسلام کی تعلیم دی ہے۔

زبان

قائداعظم کی آبائی زبان گجراتی تھی لیکن مشن سکول میں انگریزی کی تعلیم

پانے اور انگلستان میں پڑھنے کی وجہ سے علمی طور پر ان کی زبان انگریزی ہوگئی تھی۔ زیادہ تر انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔تحریک پاکستان کے وقت سے انہوں نے اُردو سیکھنا شروع کردی تھی اور آخر میں ذرا رُک رُک کر اُردو میں تقریر کر لیتے تھے۔ لیکن پاکستان کی قومی زبان کے معاملے میں ان کا ذہن صاف تھا۔ مارچ 1948ء میں مشرقی پاکستان میں انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اُردو ہوگی۔

لباس

بچپن میں گجراتی لباس پہنتے تھے۔ وہی ان کے گھر کا عام لباس تھا۔لندن میں قانون کی تعلیم کے زمانے سے انہوں نے انگریزی لباس اختیار کر لیا لیکن 1937ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں پہلی بار انہوں قراقلی ٹوپی کے ساتھ قومی لباس زیب تن کیا۔تحریک پاکستان کے زمانے میں بیشتر وہ قومی لباس ہی زیب تن فرماتے تھے۔ یہ قومی لباس بھی بے داغ و بہترین ہوتا تھا۔ لباس کے معاملے میں ان کا ذوق بہت بلند اور نفیس تھا۔ آخری عمر میں انہوں نے غیر ملکی کپڑا خریدنا بند کر دیا تھا۔ اور کم تر درجے کے پاکستانی کپڑے سے گزارا کرتے تھے۔

مس فاطمہ جناح اکثر ان کے لیے کھڈیوں کا کپڑا خریدتی تھیں۔

مکان:

بمبئی میں مالا بار ہل ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر ان کا انیسویں صدی کے طرز تعمیر کا بنگلہ خوش ذوقی اور حسن آرائش کی تصویر تھا۔

پسندیدہ چیزیں

شخصیت: کمال اتاترک

کتاب: "Gray Wolf" (اتاترک کی سوانح حیات)

شاعر: شیکسپیئر، شیلے

پھول: گلاب کارنیش

پیڑ: صنوبر

کھیل: آؤٹ ڈور بلیرڈ اور کرکٹ، ان ڈور بلیرڈ اور شطرنج

مشاغل: گھڑ سواری (بچپن اور نو جوانی میں)

کھانے: کباب، حلوہ پوری، پاپڑ

سویٹ ڈیش: فیرنی

سگریٹ کا برانڈ: کریون اے، سگار بھی پیتے تھے۔

نظریۂ پاکستان

نظریۂ پاکستان کی بنیاد دوقومی نظریہ ہے خوش قسمتی سے اس موضوع پر خود قائداعظم نے مختلف موقعوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان بیانات اور تقریروں کے منتخب ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں۔

مسلم قومیت کی بنیاد

''پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا۔ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا پہلا شخص جب مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں

رہا بلکہ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔''

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب 8 مارچ 1944ء)

اسی تقریر میں آگے چل کر آپ نے فرمایا:

''آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا محرک جذبہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔''

اس تقریر سے اس گمراہ کن خیال کی بھی تردید ہوتی ہے کہ پاکستان کے مطالبے کو ہندوؤں کی تنگ دلی نے جنم دیا یا محض معاشی خوشحالی حاصل کرنے کا ذریعہ تھا یا صرف سیاسی اقتدار کے حصول کا وسیلہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کا حصول بھی ضروری تھا۔ معاشی اور اقتصادی خوشحالی بھی مد نظر تھی لیکن اس سے اہم تر مسئلہ اور اصل مسئلہ مسلمانوں کے قومی وجود، مسلمانوں کے بحیثیت مسلمان زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا مسئلہ تھا جو بغیر پاکستان کے حصول کے ممکن نہیں تھا۔ ''نظریہ پاکستان'' اور ''دو قومی نظریے'' کی وضاحت قائداعظم نے 23 مارچ 1940ء کو قراردادِ پاکستان پر تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں کی:

''مسلمان ایک اقلیت نہیں ہیں بلکہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ قومیت کی تعریف جس طرح کی جائے، مسلمان اس تعریف کی رو سے ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ان کی اپنی الگ مملکت اور اپنی جداگانہ خودمختار ریاست ہو۔ ہم مسلمان چاہتے ہیں کہ برصغیر کے اندر ہم ایک آزاد قوم بن کر ہمسایوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ ہماری تمنا ہے کہ ہماری قوم اپنی روحانی' تمدنی 'اقتصادی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کامل ترین نشو و نما بخشے اور اس مقصد کے لیے وہ طریق عمل اختیار کر سکے جو اس کے نزدیک بہترین ہو اور ہمارے نظریات اور نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔''

آپ نے مزید فرمایا:

''اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ درحقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ ان کے پیرو آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے اور نہ ہی ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں ان کا تعلق واضح طور پر دو مختلف تہذیبوں سے ہے اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک

دوسرے کی ضد ہیں بلکہ متصادم رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات اور تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے تاریخی وسائل اور ماخذ مختلف ہیں۔ ان کی رزمیہ نظمیں' ان کے قومی ہیرو اور قابل فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر ایک قوم کا عظیم رہنما دوسری قوم کی بزرگ و برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے ایک قوم کی فتح، دوسری کی شکست ہوتی ہے۔ پس دونوں ہر اعتبار سے علیحدہ قومیں ہیں۔''

''اتحاد، ایمان، تنظیم''

قائداعظم نے قوم کو جو ٹھوس نعرہ دیا وہ ہے ''اتحاد، ایمان، تنظیم'' یہ کوئی سیاسی نعرہ نہیں تھا جو کسی وقتی مصلحت کے تحت کسی محدود وقتی مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے بلند کیا گیا ہو۔ یہ قائداعظم کی اپنی زندگی کے رہنما اصول تھے۔ جن پر وہ تمام زندگی خود کاربند رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے انہی بنیادی اصولوں کو انہوں نے اپنے ورثے کے طور پر قوم کے سپرد کیا۔ آج قائداعظم خود دنیا میں موجود نہیں لیکن ان کے دیئے ہوئے اصول قوم کی راہ نمائی کے لیے روشنی کے مینار کی طرح موجود ہیں۔ ''اتحاد، ایمان، تنظیم'' کا نعرہ ایک تکون ہے جس میں بنیادی

اہمیت ''ایمان'' کو حاصل ہے اتحاد اور تنظیم ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔ قائداعظم نے قوم کو اتحاد ایمان تنظیم کی بار بار تلقین کی۔

27 جون 1946ء کو مسلم لیگ کونسل بمبئی سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

''میں محسوس کرتا ہوں کہ اب مسلم لیگ کے لیے وہ وقت آ گیا ہے جب ہمارا نعرہ اتحاد، ایمان اور تنظیم ہونا چاہیے اگر ہماری قوم میں کافی طاقت نہیں ہے تو ہمیں کافی طاقت پیدا کرنا ہوگی۔''

25 جون 1947ء کو آپ نے فرمایا:

''مسلمانوں کی نجات ان کے اتحاد، ایمان اور تنظیم میں پنہاں ہے۔''

7 جولائی 1947ء کو لندن مسلم لیگ کی دعوت کے جواب میں قائداعظم نے یہ ٹیلی گرام بھیجا۔

پاکستان بن گیا اس کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ آپ حصول پاکستان کی خوشی میں ایک ضیافت منعقد کر رہے ہیں اور اس میں مجھے بھی مدعو کیا ہے۔ اب ہمارے سامنے پاکستان کی تعمیر و ترقی کا زیادہ بڑا اور مشکل کام ہے جو ہماری طاقت و توانائی کے ایک ایک ذرے کا تقاضا کرتا ہے۔ ان شاء اللہ ہم اس نئی

اور سب سے بڑی اسلامی مملکت کو مکمل اتحاد، ایمان اور تنظیم سے دنیا کی ایک عظیم اور مثالی مملکت بنا دیں گے۔

پاکستان بننے کے چند مہینے بعد 30 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے ریڈیو پاکستان لاہور سے قوم کو یوں خطاب کیا:

''اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں لیکن میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور قوم کے نام پیغام دیتا ہوں کہ اپنے اندر جذبہ اور جوش وخروش پیدا کرو، حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ ان شاء اللہ کامیابی ہماری ہے ان مشکل حالات میں کیا ہم مایوس ہو کر بیٹھ جائیں؟ ہرگز نہیں۔ اسلام کی تاریخ اولوالعزمی، حوصلے اور مستقل مزاجی کی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں، رکاوٹوں اور مصیبتوں کے باوجود آگے بڑھتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ سات کروڑ افراد کی ایسی متحد قوم جو عظیم ارادے کی مالک ہو، عظیم تہذیب رکھتی ہو، عظیم تاریخ کی وارث ہو، اسے کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ اب یہ آپ پر ہے کہ کام کریں۔ کام، کام اور کام کامیابی ہمارا مقدر ہے اور اپنا یہ نعرہ کبھی نہ بھولیے۔ اتحاد، ایمان، تنظیم۔''

19 فروری 1948ء کو آسٹریلیا کے لوگوں کے نام نشریاتی پیغام میں قائداعظم نے ''ایمان'' کی یوں وضاحت کی۔

ہماری وحدت اور ہم آہنگی کا راز ہے ایمان۔ اللہ پر ہمارا ایمان، اپنی ذات پر ہمارا ایمان، اپنی تقدیر پر ہمارا ایمان۔

28 مارچ کو ڈھاکہ کے جلسۂ عام میں قائداعظم نے فرمایا:

''پاکستان مسلمانوں کے اتحاد کا مظہر ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے آپ کا فرض ہے کہ آپ دل و جان سے اس کی پاسبانی اور حفاظت کریں۔ اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں مسلمان اور پاکستانی محض اتفاقیہ تو جان لیجئے کہ پاکستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔''

اتحاد کی ضرورت پر 17 اپریل 1948ء کو پشاور میں قبائلی سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا:

''ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ اور مجھے امید ہے کہ اس عظیم مملکت پاکستان کی تعمیر و ترقی کا جو کام اس وقت ہمارے سامنے ہے، اسے دیکھتے ہوئے سب کو اس بات کا پورا احساس ہو گا کہ اس وقت اتحاد کی

پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔"

قائداعظم نے نہ صرف اتحاد کی تلقین کی۔ بلکہ اتحاد کی بنیاد کی بھی نشاندہی کی۔اس خطاب میں آپ نے فرمایا:

"ہم مسلمان ایک خدا، ایک رسول ﷺ، ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں پس یہ لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم ملت کی حیثیت سے بھی ایک ہوں۔"

پاکستان فضائیہ کے حوالے سے تنظیم کی اہمیت اور ضرورت پر آپ نے فرمایا:

"ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز فضائیہ میں جذبہ شوق اور سخت نظم وضبط ہے میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم وضبط اور خود اعتمادی ہی پاکستان کی فضائیہ کو پاکستان کے شایانِ شان بنا سکتی ہے۔"

پاکستان بحریہ کے جہاز "دلاور" کے افتتاح پر قائداعظم نے ایمان، تنظیم کی اہمیت پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا۔ "پاکستان کے دفاع کو مضبوط تر بنانے میں ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے اس کے لیے آپ کا نعرہ ہونا چاہیے......

"اِیمان، اِتّحاد اور اِیثار"

تعمیرِ پاکستان

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے قائد اعظم کی راہ نمائی میں برصغیر کے مسلمانوں کی مسلسل اور بے مثال جدوجہد، بے دریغ قربانی وایثار سے 14 اگست 1947ء کو پاکستان بہت ہی مشکل ترین حالات میں وجود میں آ گیا۔ لیکن تعمیر پاکستان کا ایک مشکل مرحلہ باقی تھا۔ 17 اگست 1947 کو جمعۃ الوداع تھا۔ قائد اعظم نے اپنے پیغام میں کہا:

"مسلمانان ہند نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ وہ ایک متحد قوم ہیں ان کا نصب العین صحیح اور انصاف پر مبنی ہے آئیں اس نعمت پر ہم عاجزی اور انکسار سے خدا کا شکر بجالائیں اور دعا کریں کہ وہ ہمیں اس نعمت کے لائق بنادے آج کے دن قومی تاریخ کا ایک صبر آزما دور ختم ہو رہا ہے اور ایک نئے اور قابل قدر دور کا

آغاز ہو رہا ہے۔ پاکستان کی سرزمین میں زبردست خزانے چھپے ہوئے ہیں مگر اس کو ایک ایسا ملک بنانے کے لیے جو مسلمان قوم کے رہنے کے قابل ہو۔ ہمیں اپنی قوت اور محنت کے ذخیرے کا ایک ایک ذرّہ صرف کرنا پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ تمام پاکستانی پاکستان کی تعمیر میں دل و جان سے حصہ لیں گے۔"

دوسرے دن (18 اگست 1947ء) پاکستان کی پہلی عید الفطر تھی اپنے یومِ عید کے پیغام میں قائداعظم نے پھر پاکستانیوں کو یاد دلایا:

"اس میں شک نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کرلیا ہے لیکن یہ تو محض آغاز ہے اب بڑی بڑی ذمہ داریاں ہمارے کندھوں پر آپڑی ہیں اور جتنی بڑی ذمہ داریاں ہیں اتنا ہی بڑا ارادہ، اتنی ہی عظیم جدوجہد کا جذبہ ہم میں پیدا ہونا چاہیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے لیے جو قربانیاں دی گئیں ہیں اور جو کوششیں کی گئیں ہیں پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے بھی کم از کم اتنی ہی قربانیوں اور کوششوں کی ضرورت پڑے گی۔ حقیقی معنوں میں ٹھوس کام کا وقت آ پہنچا ہے اور مجھے پورا پورا یقین ہے کہ مسلمانوں کی ذہانت اور فراست اس بارِ عظیم کو حوصلے سے اٹھا سکے گی۔ اور اس بظاہر پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کی تمام

مشکلات کو آسانی سے طے کرلے گی۔"

11 اکتوبر 1947ء کو حکومت پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے تخلیق پاکستان کے نصب العین کی یوں وضاحت کی۔

"کسی قومی ریاست کو معرض وجود میں لانا مقصد بالذات نہیں ہوسکتا بلکہ کسی مقصد کے حصول کے ذریعہ کا درجہ رکھتا ہے۔ ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں جو ہماری تہذیب وتمدن کی روشنی میں پھلے اور پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔"

اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے متواتر قربانی وایثار کی ضرورت تھی۔ چنانچہ 24 اکتوبر 1947ء کو اپنے عیدالاضحیٰ کے پیغام میں قائداعظم نے پاکستانیوں کو پھر یاد دلایا:

"ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور قربانیاں دینا سیکھیں گے اتنا ہی زیادہ پاکیزہ، خالص اور مضبوط قوم کی حیثیت سے ہم ابھریں گے۔ جیسے سونا آگ میں تپ کر کندن ہو جاتا ہے۔"

اگست 1947ء کے بعد کے مہینے پاکستانیوں کے لیے بہت صبر آزما تھے ان نہایت ہی مشکل حالات میں قائداعظم اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود قوم کی

راہنمائی فرماتے رہے۔ 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور کے جلسۂ عام میں قائداعظم نے اعلان کیا:

''اگر ہم ہر معاملے میں راہنمائی قرآن مجید سے حاصل کریں تو مجھے یقین ہے کہ آخری کامیابی ہماری ہوگی۔''

اسی دن ایک نشری بیان میں قائداعظم نے قوم کو یہ پیغام دیا:

''آیئے ہم اپنی عظیم قوم اور اپنی خود مختار مملکت پاکستان کی تشکیل و تعمیر کے لیے کچھ تدبیر کریں۔ یہ ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے سنہری موقع ہے اور اس کی خوش قسمتی بھی کہ وہ اپنے حصے کا بھرپور اور مکمل کردار ادا کرے اور بڑی سے بڑی ذاتی قربانیاں دے اور پاکستانی قوم و ملک کو عظیم ترین قوم اور ملک بنانے کے لیے انتھک دن رات محنت کرے۔ اب پاکستان، اس کی عزت اور ترقی آپ کے ہاتھوں میں ہے بلاشبہ ہم میں بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ پاک سرزمین کے زبردست وسائل و ذرائع اور امکانات ترقی کے حامل ہیں۔ باری تعالیٰ نے ہمیں قدرتی دولت بڑی فراوانی کے ساتھ عطا کی ہے۔ اب یہ کام انسانی ہاتھوں کا ہے کہ وہ اس دولت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ اس بارِ عظیم (تعمیرِ پاکستان)

کی شدت اور سنگینی سے گھبرانا نہیں چاہیے تاریخ میں ایسی نئی اقوام کی کئی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے محض قوت ارادی اور بلند کرداری سے خود کو بنایا اور عظیم کیا۔ آپ کا خمیر فولادی قوتوں سے اٹھا ہے اور ہمت کے معاملے میں آپ دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ پھر آخر آپ دوسروں کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اپنے آباؤاجداد کی طرح کی کامیابی۔ آپ کو اپنی ذات میں فقط مجاہدوں کی سی سپرٹ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ ایسی قوم ہیں جس کی تاریخ حیرت انگیز طور پر بلند کردار، باحوصلہ، شجاع اور اولُو العزم ہستیوں سے بھری پڑی ہے۔ اپنی روایات کی رسی مضبوطی سے تھام لیجئے اور اپنی تاریخ میں شان وشوکت کے ایک اور باب کا اضافہ کیجئے۔"

تعمیر پاکستان میں افواج پاکستان کو جو کردار ادا کرنا تھا اس کی نشان دہی یوں کی:

"ہم پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور مستحکم اور مضبوط بنیاد پر تعمیر کرنے کی جنگ، سنگین تر جنگ، ابھی جاری ہے۔"

(افواجِ پاکستان سے خطاب 21 فروری 1948ء)

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ اور افواجِ پاکستان

قائداعظم ہر میدان میں قائداعظم تھے۔ پاکستان بنتے ہی پاکستانی افواج کو منظم کرنا اور ضروری اسلحہ سے لیس کرنا ایک اہم مسئلہ تھا۔ لیکن اس سے بھی اہم مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی مسلح افواج کو ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جائے جو ایک آزاد نظریاتی ریاست کے بازوئے شمشیر زن کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی تھیں۔ وہ اب محض بہادر سپاہی نہیں بلکہ ایک عظیم نظریئے، ایک عظیم نصب العین کے محافظ بھی تھے۔ قائداعظم نے بحیثیت سربراہ مملکت اور بحیثیت قوم کے سب سے بڑے قائد کے مسلح افواج کی تنظیم اور ترقی میں ذاتی دلچسپی لی اور انہیں ان کی نئی ذمہ داریوں اور نئی منزلوں سے آگاہ بھی کیا۔ 14 جون 1948ء کو کوئٹہ میں قائداعظم نے افواجِ پاکستان کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

''پاکستان کی دوسری ملازمتوں کے مقابلے میں افواجِ پاکستان

کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اسی نسبت سے آپ کی ذمہ داریاں بھی زیادہ ہیں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے اس کی بنا پر بلاشبہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری افواج کے حوصلے قابلِ فخر اور ہمتیں بلند ہیں اور سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ ہے کہ ہر افسر اور سپاہی خواہ وہ کسی فرقے، نسل یا علاقے سے ہو، وہ سچے پاکستانی کی طرح کام کر رہا ہے۔ اگر آپ اسی جذبے سے سچے سپاہیوں اور سچے پاکستانیوں کی طرح بے غرضی سے کام کرتے رہے تو پھر پاکستان کو کسی کا ڈر نہیں۔"

پاکستان کی تعمیر اور ترقی میں افواجِ پاکستان کو ایک قومی نقطۂ نظر دیتے ہوئے قائداعظم نے 21 فروری 1948ء کو کراچی میں افواج پاکستان سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ تو جیت لی ہے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے اور پاکستان کو مستحکم اور مضبوط تر بنیادوں پر تعمیر کرنے کی سنگین تر جنگ ابھی جاری ہے اور اگر ہمیں ایک عظیم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہم کامیابی حاصل نہیں کر لیتے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو زندہ رہنے کا

زیادہ اہل ہوتا ہے ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم اس نئی آزادی کے اہل ہیں۔آپ نے دنیا کو فسطائیت اور آمریت کے پنجوں سے چھڑایا ہے آپ نے جمہوریت کی بقاء کے لیے دنیا کے دور دراز گوشوں میں جاکر دادشجاعت دی ہے اب ایک نئی منزل، ایک نیا چیلنج آپ کے سامنے ہے۔اب آپ کو اپنی پاک سر زمین میں اسلامی جمہوریت، اسلامی معاشرتی انصاف اور انسانی مساوات کے اصولوں کی تجدید اور پاسبانی کرنی ہے۔ اس اہم تر اور سخت کام کے لیے آپ کو ہمہ وقت تیار، ہمہ تن ہوشیار رہنا پڑے گا۔آرام کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اگر آپ ایمان، تنظیم اور بے لوث فرض شناسی کے زریں اصولوں پر کار بند رہے تو کوئی شے ایسی نہیں جسے آپ حاصل نہ کر سکیں۔''

23جون 1948ء کو پاکستان نیوی کے جہاز ''دلاور'' کے افتتاح کی تقریب پر قائداعظم نے فرمایا:

''پاکستان کے دفاع کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں آپ میں سے ہر ایک کو اپنی جگہ الگ الگ انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے اس لیے آپ کا نعرہ ہونا چاہیے ''ایمان، تنظیم اور ایثار''

آپ اپنی تعداد کے کم ہونے پر نہ جائیے۔ اس کمی کو آپ کو ہمت و استقلال اور بے لوث فرض شناسی سے پورا کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اصل چیز زندگی نہیں بلکہ صبر و تحمل اور عزم صمیم ہیں جو زندگی کو زندگی بناتے ہیں۔"

11 اکتوبر 1947ء کو کراچی میں افواجِ پاکستان کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"مجھے پورا پورا احساس ہے کہ آپ میں بیشتر ایسے ہیں۔ جنہوں نے گزشتہ جنگ کے دوران شدید اور سخت محنت کی زندگی بسر کی ہے۔ اب انہیں آرام کی ضرورت ہے لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے تو جنگ اب شروع ہوئی ہے اور اگر ہم کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں غیر معمولی محنت اور جد و جہد سے کام کرنا پڑے گا یہ وقت ذاتی ترقی اور مرتبے حاصل کرنے کا نہیں۔ یہ وقت ہے تعمیری کوشش کا، بے لوث جد و جہد کا، مستقل مزاجی سے فرض شناسی کا۔"

اسی موقع پر آپ نے فرمایا:

"خدا نے ہمیں یہ سنہری موقع عطا کیا ہے کہ ہم ثابت کر دکھائیں کہ ہم واقعی ایک نئی مملکت کے معمار ہونے کی اہلیت

رکھتے ہیں۔ خدانخواستہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ ہمارے متعلق یہ
کہیں کہ ہم یہ عظیم بار اٹھانے کے قابل نہ تھے۔"

21 فروری 1948ء کو قائداعظم نے بری فوج کے جوانوں سے یوں خطاب کیا:

"اس مشینی دور میں جب کہ انسان کی خوف خدا سے عاری ذہانت تباہی و بربادی کے نت نئے تباہ کن آلات ایجاد کرتی رہتی ہے۔ آپ کو زمانے کے مطابق چلنا پڑے گا اور اپنے علم، ساز و سامان اور اسلحے کو جدید ترین معیار کے مطابق رکھنا پڑے گا۔ اس لیے نہیں کہ ہم کسی کے خلاف جارحیت کا ارادہ رکھتے ہیں بلکہ یہ ہماری سلامتی کا بنیادی تقاضا ہے مضبوط ہونا ہی دوسروں کی جارحیت سے محفوظ رہنے کی ضمانت ہے۔"

13 اپریل 1948ء کو آپ نے فرمایا:

"کبھی نہ بھولئے کہ اتحاد میں برکت ہے اپنی رجمنٹ پر فخر کیجئے اپنے ڈویژن اور اپنی کور پر فخر کیجئے۔ اپنے پاکستان پر فخر ہے نہ صرف فخر کیجئے بلکہ خود کو اس کے لیے وقف کر دیجئے۔ اس لیے کہ پاکستان کو آپ پر اعتبار ہے پاکستان آپ پر انحصار کرتا ہے۔ پاکستان آپ کو اپنا محافظ سمجھتا ہے۔ اس اعتماد کی لاج

رکھیے اور خود کو اس اعتماد کا اہل ثابت کیجئے۔"

15 اپریل 1948ء کو پنجاب رجمنٹ سے پشاور میں خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا:

"ہمیشہ ان تصورات اور عزائم کے مطابق زندگی بسر کیجئے جن کے لیے آپ حال ہی میں اپنی زندگیاں وقف کرنے کا عہد کرچکے ہیں۔ میری مراد پاکستان کی خدمت سے ہے کمزوروں کی حمایت اور شہیدوں کی مقدس یاد کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کر کے اسلام کی شان وشوکت میں چار چاند لگایئے۔"

اسی تقریب میں آپ نے فرمایا:

"الفاظ کی اتنی اہمیت نہیں جتنی قدر و قیمت افعال کی ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ جب پاکستان کے دفاع، قوم کی سلامتی اور حفاظت کے لیے آپ کو بلایا جائے گا تو آپ اسلاف کی روایت کے مطابق شاندار کارناموں کا مظاہرہ کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پاکستان کے ہلالی پرچم کو سر بلند کیے رکھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی عظیم قوم کی عزت اور وقار کو ہر حال میں، ہر قیمت پر برقرار رکھیں گے۔"

13 اپریل 1948ء کو رسالپور میں فضائی فوج سے خطاب کرتے ہوئے

قائداعظم نے فرمایا:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ملک مضبوط فضائیہ نہیں رکھتا وہ دشمن کے رحم وکرم پر ہے پاکستان کو چاہیے کہ جلد سے جلد اپنی فضائی طاقت کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے۔ ایک ایسی مستعد اور ہوشیار فضائیہ جس کا ثانی دنیا میں کوئی اور نہ ہو ایسی فضائیہ جو پاکستان کے دفاع میں بری اور بحری طاقت کی دست وبازو ثابت ہو۔''

اس موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

''ہوائی جہازوں اور ان کے عملے کی تعداد سے کوئی فرق نہیں پڑتا اصل چیز فضائیہ میں جذبۂ پُرشوق اور سخت نظم وضبط ہے۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف نظم وضبط اور خوداعتمادی ہی سے پاکستان کی فضائیہ پاکستان کے شایان شان بن سکتی ہے۔''

آخر میں قائداعظم کا وہ پیغام جو پاکستانی افواج کے ہر سپاہی، ہر افسر کے نام'' آرڈر آف دی ڈے'' کی حیثیت رکھتا ہے۔

''خدا کی قسم ہم کبھی ہار نہ مانیں گے۔ میں پاکستان کی حفاظت کے لیے تنہا لڑوں گا اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے

ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لیے جنگ لڑنا پڑے تو کسی صورت میں بھی ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں میں، جنگلوں میں، میدانوں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔"

(قائداعظم زندہ باد)

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ اور تعلیم

قائداعظم کی قیادت ہمہ گیر تھی۔ قومی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی راہ نمائی کی روشنی سے روشن نہ ہو۔ تعلیم کے موضوع پر ان کے بیانات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

تعلیم، زندگی اور موت کا مسئلہ

''ہماری قوم کے لیے تعلیم زندگی اور موت کا مسئلہ ہے دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا تو نہ صرف یہ کہ آپ پیچھے رہ جائیں گے بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اس مقصد کی

خاطر جتنی بھی مصیبتیں جھیلی جائیں کم ہیں۔''

(کراچی 26 ستمبر 1947ء)

تلوار سے بھی زیادہ طاقتور

3 جولائی 1943ء کو بلوچستان مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر طلبہ نے تلوار کو روایتی تحفے کے طور پر پیش کیا تھا۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں یہ معنی خیز فقرے کہے:

''یہ تلوار جو آپ نے مجھے عنایت کی ہے صرف حفاظت کے لیے اٹھے گی لیکن فی الحال جو سب سے ضروری امر ہے وہ تعلیم ہے۔ علم تلوار سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔ جایئے اور علم حاصل کیجیے۔''

لیکن وہ برطانوی دور کے پرانے طرز تعلیم کی خامیوں سے خوب واقف تھے۔ چناں چہ انہوں نے کل پاکستان تعلیمی کانفرنس کراچی کو 27 نومبر 1947ء کو یہ پیغام دیا۔

''ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی اور پروگرام کو ایسے خطوط پر چلانا ہے جو ہمارے لوگوں کے مزاج کے مطابق ہو جو ہماری تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو، جو دنیا میں ہونے والی وسیع ترقیوں

اور جدید تقاضوں کے مطابق ہو۔''

آپ نے زور دے کر کہا:

''پاکستان کی ترقی کا انحصار زیادہ تر طرزِ تعلیم پر ہے۔ یعنی ہم کیونکر اپنے بچوں کو پاکستان کا سچا خدمت گزار بناتے ہیں۔ تعلیم کا مطلب محض کتابی تعلیم نہیں ہوتا اور ہمارے ہاں تو کتابی تعلیم بھی خیر سے بہت کمزور اور ناقص ہے ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اپنے لوگوں کی توانائیوں کو ایک راہ پر لگائیں اور آنے والی نسلوں کے کردار کی تعمیر ابھی سے کریں اس امر کی فوری اور اشد ضرورت ہے کہ ہمارے جوانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعلیم دی جائے کیونکہ اسی سے ہماری مستقبل کی معاشی زندگی کا معیار بلند ہوگا۔''

تعلیم کے ساتھ کردار کی تربیت پر قائداعظم نے ہر موقع پر زور دیا، انہوں نے فرمایا:

''بغیر کردار کے ڈگری کا حصول محض تضیعِ اوقات ہے۔''

تعلیم کے عمل میں ذہنی نشو ونما کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت اور مضبوطی کی جو اہمیت ہے اس کے بارے میں قائداعظم نے فرمایا:

''آپ کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ جسمانی قوت پیدا کیجئے

لڑائی جھگڑے زبردستی کے لیے نہیں۔ بلکہ سپاہیانہ قوت پیدا کرنے کے لیے تاکہ آپ عمر بھر قومی زندگی کے ہر شعبے میں طاقت وتوانائی کا سرچشمہ بنے رہیں۔"

(کل پاکستان اولمپک کھیل 23 مارچ 1948ء)

نظریۂ پاکستان منزل بہ منزل

مارچ 1944ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان اسی روز وجود میں آ گیا تھا جس روز ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا قائداعظم کے اس قول میں دوقومی نظریہ کی بنیادی توجیہہ ہے۔ چوں کہ اس مذاکرے کا موضوع نظریۂ پاکستان کی تاریخ ہے اس لیے میں اس تصور کی چند کڑیاں جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں۔

برصغیر ہندو پاک میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ 712 عیسوی میں محمد بن قاسم کے جہاد سے شروع ہوتی ہے۔ مسلمان فاتح یہاں رہے، لبے بھی، اسے انہوں نے وطن بھی بنایا اور 1857ء میں سقوط دہلی تک تقریباً ایک ہزار سال انہوں نے یہاں حکومت بھی کی۔ لیکن مہاجر مسلمان اور مقامی مسلمان جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے۔ سماجی اور معاشرتی اعتبار سے ہمیشہ ہندوؤں سے علیحدہ ہی رہے۔ وہ

ہندو قومیت اور تہذیب میں کبھی جذب نہیں ہوئے۔ دو قومیتوں کے دھارے مذہبی اور تہذیبی سطح پر تیل اور پانی کی روؤں کی طرح ساتھ ساتھ تو چلتے رہے لیکن ملے کبھی نہیں۔ جب تک مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی طاقت مضبوط رہی۔ یہ معاشرتی اور تہذیبی علیحدگی کوئی مسئلہ بن کر سامنے نہیں آئی لیکن 1707ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا شیرازہ بکھرتے ہی ہندوؤں نے مرہٹوں کی قیادت میں قومی بنیاد پر مسلمانوں کی حکومت کے خلاف پرانی سیاسی دشمنی کو ایک منصوبے کے تحت منظم کرنا شروع کیا۔ ہندو قومیت کی اس جارحانہ تحریک کا نشانہ براہ راست مسلمان عوام بن رہے تھے۔

ہندو مسلم قومیتوں کے ٹکراؤ کے اثرات کو سب سے پہلے غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی نے محسوس کیا۔ وہ پہلے مفکر تھے جنہوں نے مسلم قومیت کی نظریاتی بنیادوں پر تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور مسلمانوں کو اصل اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی۔ اور اسلام کے معاشرتی اور معاشی اصولوں کی زمانے کے حالات کے مطابق وضاحت کی اور اسلام کو ایک متحرک قوت اور دین کے طور پیش کیا۔ انہوں نے یہ عملی سیاسی قدم بھی اٹھایا کہ ذاتی خطوط لکھ کر احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے تخت وتاراج اور مسلمانوں کی حالتِ زار سے آگاہ کیا اور اسلام کے نام پر مدد کی درخواست کی۔ چنانچہ 1737ء اور بعد کے معرکوں میں ابدالی نے مرہٹوں کو عبرت ناک شکستیں بھی دیں۔

مرہٹے اور ہندو میدان جنگ میں تو ہار گئے۔ لیکن ہندو اور مسلمان قومیتوں کی جو جنگ کھل کر شروع ہو چکی تھی وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ وہ جنگ آگ کی طرح پھیلتی ہی چلی گئی۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی فکری تحریک ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کا پہلا اہم اشارہ تھی۔ پھر 19 ویں صدی کے شروع میں سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور بنگال میں تیتو میر اور حاجی شریعت اللہ کی تحریکیں مسلمانوں کے لیے علیحدہ قومی وجود کی لہریں تھیں۔ 1857ء کے بعد مسلمانوں کے میر کارواں سر سید احمد تھے۔ وہ مسلمانوں کے قومی مفاد کے لیے تگ و دو کر رہے تھے مگر وہ ہندو مسلم اتحاد کے خلاف بھی نہیں تھے لیکن بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ ہندو مسلم ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ حالی نے حیات جاوید میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ:

> ”جب 1867ء میں بنارس کے ہندوؤں نے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کیا، اور سخت متعصبانہ رویہ اختیار کیا تو سر سید نے بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے صاف کہہ دیا کہ ہندو مسلمان متحد نہیں رہ سکتے۔ سر سید کے الفاظ ہیں:
>
> ”اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس

سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ
کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھ لے گا۔"

قابلِ غور نقطہ یہ ہے کہ سرسید نے دو قوموں کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہندو مسلمانوں میں مزید اختلاف کی پیش گوئی کی ہے جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ سرسید نے ہندو ذہن کو اچھی طرح پرکھ لیا تھا۔ اس حقیقت کا احساس کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کو 1880ء میں قائم کی گئی کانگرس میں شرکت سے باز رکھا تھا۔

سرسید احمد خان نے اپنی زندگی کے آخری دور میں مغربی طرز کی جمہوریت کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا اور ہندوستان کو برصغیر قرار دیتے ہوئے مختلف قوموں کا وطن شمار کیا۔ بلکہ سرسید کی ایک تقریر تو ایسی بھی ہے کہ جس میں پاکستان کی نظریاتی ہئیت تشکیل پاتی نظر آتی ہے۔ بحوالہ کتاب "آخری مضامین صفحہ نمبر 49" "پاکستان کی نظریاتی بنیادیں صفحہ نمبر 104۔" 1894ء میں جالندھر میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کہا ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی۔ ہم آپ اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے بغیر یونیورسٹی کی غلامی کے، ہم آپ اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں گے۔ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں ہوگی اور کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (ﷺ)" کا تاج سر پر۔ آخری جملے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے لیے ایک ایسی مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ نظریۂ پاکستان کے پہلے معمار سر

سید تھے۔ ان ہی کے مبارک ہاتھوں ہندوستان میں مسلمانوں کی نئی ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اُنہوں نے ہی علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی جو پاکستان کی اساس تھی۔

1882ء میں ہندوستان میں البرٹ بل نافذ ہوا۔ اس کے بعد سے ہندو مسلمان کے تعلقات کشیدہ رہنے لگے اور ایک دوسرے کی رسوم اور تہواروں پر جھگڑے ہونے لگے۔ اس صورت حال پر عبدالحلیم شرر نے رسالہ تہذیب 23اگست 1890ء کے شمارے میں لکھا:

''ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی فرقے کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں ہو سکتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کی طرف توجہ نہ دے تو بہتر ہے کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان باہم تقسیم کرلیں اور اپنی آبادی علیحدہ کرلیں۔''

مولانا عبدالحلیم شرر کا یہ آخری جملہ کہ ہندوستان کے اضلاع ہندو مسلمان آپس میں تقسیم کرلیں پاکستان کی منزل کی طرف واضح نشان دہی کرتا ہے۔

1905ء میں تقسیم بنگال کے بعد ہندوؤں نے جو مخالفانہ رویہ اختیار کیا اس سے مسلمان لیڈروں کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کا بھی علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیے پھر منٹو مارلے اصلاحات بھی آنے والی تھیں۔ چنانچہ اکتوبر 1906ء میں

سر آغا خان کی سر براہی میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے ہند سے ملا اور جدا گانہ حق انتخاب کا مطالبہ پیش کیا۔ دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں نواب سلیم اللہ کے گھر مسلم لیگ قائم ہوئی۔

1909ء میں منٹو مارلے اصلاحات نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق مان لیا اور دوسرے تحفظات بھی دیے یہ پاکستان کی طرف پہلا آئینی قدم تھا۔ لیکن آزادی کا خیال ابھی کوسوں دور تھا1914ء کے اوائل میں لندن کے اخبار ڈیلی ایکسپریس میں ایک نقشہ شائع ہوا جس میں قسطنطنیہ سے سہارن پور تک شمالی ہند کا علاقہ ایک تیر سے ملایا ہوا تھا جس کو مسلم کاریڈور کا نام دیا گیا۔اس کا مصنف ٹائمز آف انڈیا کا سابق ایڈیٹر لورل فریزر تھا۔ یہ بھی مسلمانوں کے ہندوستان سے علیحدہ امکانی وطن کی طرف اشارہ تھا۔

1915ء میں بزم شبلی سے خطاب کرتے ہوئے چودھری رحمت علی نے کہا تھا کہ ہندوستان کا شمالی مغربی حصہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ اسے مسلم ریاست میں بدلا جائے۔ 1916 میں میثاق لکھنؤ ہوا یہ مسٹر جناح کی کوششوں سے ہندو اور مسلمانوں کے سیاسی اتحاد کی پہلی اور آخری ٹھوس کوشش تھی۔ اس میں جداگانہ انتخاب کا اصول کانگریس نے بھی مان لیا تھا۔لیکن بعض سیاسی مفکر اس وقت بھی اسی خیال پر مصر تھے کہ ہندوستان کو ہندو مسلم ریاستوں میں تقسیم کرنا ہی ہند کے سیاسی مسئلہ کا بہترین حل ہے۔

1917ء میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس اسٹاک ہوم کے موقع پر علی گڑھ کے خیری برادران نے تقسیم ہند کا خیال پیش کیا تھا 1920ء میں بدایوں (یوپی) کے اخبار ذوالقرنین میں عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی کے نام ایک کھلا خط شائع کرایا۔ جس میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں اضلاع کی فہرست بھی دی گئی۔ 1921ء میں حسرت موہانی کے بیانات سے 1922ء میں نادر علی ناگپوری کے کتابچے سے تقسیم ہند کی تائید ہوتی ہے۔ 1923ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خان نے فرنٹیئر انکوائری کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے تقسیم ہند کی تجویز پیش کی کہ پشاور سے آگرہ تک علاقہ مسلمانوں کو دیا جائے۔

14 دسمبر 1924ء کے اخبار ٹریبون میں خود کانگریسی رہنما لاجپت رائے نے تقسیم ہند کے حق میں لکھا۔ 26 مئی 1925ء کے کامریڈ اخبار میں مولانا محمد علی نے صوبے سرحد میں اصلاحات کی حمایت کرتے ہوئے لورل فریزر کے مسلم کا ریڈور کا حوالہ بھی دیا۔ جس میں ہندوؤں نے بڑی لے دے کی۔ 1926ء میں مولانا عبیداللہ سندھی نے تقسیمِ ہند کے خیال کا اعادہ کیا۔ اکتوبر 1928ء میں آغا خان نے لندن کے اخبار ٹائمز میں لکھا۔ پھر دسمبر 1918ء میں آل پارٹیز کا نفرنس دہلی میں آغا خان نے پھر اسی تجویز کو دہرایا۔ لیکن اب تک یعنی دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس 1929ء تک تقسیم ہند کے جو خیالات سامنے آئے وہ بیشتر غیر سیاسی مفکروں کے ذاتی تاثرات کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی بہت زیادہ سیاسی اہمیت

نہیں تھی۔

- مارچ 1928ء میں ہندوستان کا آئندہ آئینی ڈھانچہ تیار کرنے کے لیے سائمن کمیشن آیا۔ جس کے مقابلے میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی جناح اس وقت تک بھی کانگریس سے مفاہمت کرنے کو تیار تھے۔ نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کو سخت مایوس کیا۔ چنانچہ 1928ء کے آغاز اور 1929ء کے وسط میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں پھر مسلمانوں کے لیے آئینی تحفظات کی پختہ بنیاد تلاش کرنے کی کوشش شروع ہوئی اپریل 1930ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس نے انڈین کنفیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے، صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کیا تھا۔

29 دسمبر 1930ء میں الہ آباد میں علامہ محمد اقبال کی صدارت میں مسلم لیگ کا جو جلسہ ہوا اس کے خطبہ میں علامہ محمد اقبال نے پہلے تو وہی کہا جو مسلم لیگ کا سرکاری موقف تھا۔ ان کے الفاظ تھے:

''مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ ہندوستان کے وفاق کے اندر ان کو حکومت خوداختیاری دے دی جائے، بالکل جائز ہے۔''

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے صرف لیگ کے نقطہ نظر کو مدلل انداز میں بیان کرنے پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی رائے کو بھی بیان کیا۔ جو اصل میں پاکستان کی طرف پہلا واضح قدم تھا۔ اس لیے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو تصورِ پاکستان کا خالق کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل نیا نہیں تھا۔ علامہ محمد اقبال کے

اپنے الفاظ یہ تھے۔

''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک واحد آزاد مسلم ریاست تشکیل کی جائے خواہ سلطنت برطانیہ سے اس کا تعلق ہو یا نہ ہو۔ ایسی شمال مغربی ریاست کی تخلیق ہندستانی مسلمانوں یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔''

1930ء میں ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مکمل آزاد مسلم ریاست کے قیام کی تجویز محمد اقبال کی اپنی ذاتی تجویز تھی۔ اس کو مسلم لیگ کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی۔ 32-1931ء کی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں میں یک جہتی نہیں تھی۔ عام رجحان فیڈریشن یا کنفیڈریشن کی طرف تھا۔ خود علامہ محمد اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس نومبر 1932ء میں کہا:

''علیحدہ مرکز کی ضرورت نہیں صوبے خود مختار اور آزاد ہوں۔''

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جس آزاد شمال مغربی مسلم ریاست کا تصور کیا پیش کیا تھا۔ اس کا کوئی نام تجویز نہیں کیا گیا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ایک خیال تھا مطالبہ نہ تھا۔ مگر جب بعض انگریزوں اور ہندوؤں نے ان کی تجویز کو تقسیم کے معنی پہنائے تو اکتوبر 1932ء کے ٹائمز لندن میں علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کی کہ یہ محض تجویز تھی مطالبہ نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک لکھا:

''یعنی کوئی معقول مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا کہ برٹش کامن ویلتھ سے باہر شمال مغرب ہند میں کوئی آزاد ریاست یا ریاستیں قائم کرنا ممکن عملی سیاست ہے۔''

لیکن 15 دسمبر 1932ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسے میں علامہ محمد اقبال نے پھر زیادہ مدلل انداز میں علیحدہ ریاست کے قیام کو بہترین امکانی حل بتایا گول میز کانفرنس میں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے سے مایوس ہوکر دسمبر 1932ء تک علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ''اب الگ مطالبہ ملک کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔''

جنوری 1933ء میں کیمبرج کے چودھری رحمت علی اور ان کے تین ساتھیوں نے ایک تاریخ ساز کتابچہ شائع کیا (Now or Never) ''اب یا کبھی نہیں۔'' جس میں متحدہ ہندوستانی قومیت کو واضح طور پر مسترد کیا گیا تھا۔ گول میز کانفرنس میں زیرِ غور وفاقی آئین کی شدید مخالفت کی گئی تھی اور کشمیر، پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد مسلم مملکت کی تشکیل پر زور دیا گیا تھا۔ اس کتابچے میں لفظ پاکستان بھی وضع کیا گیا تھا۔ بقول رحمت علی لفظ پاکستان فارسی لفظ بھی ہے اور اُردو بھی، اس میں ﴿پ، پنجاب۔ الف، افغانیہ (سرحد)۔ کاف، کشمیر۔ س، سندھ اور تان، بلوچستان﴾ سے لیا گیا۔ پاکستان کے لفظی معنی ''پاک لوگوں کا وطن۔''

گول میز کانفرنس کے دوران چودھری رحمت علی نے انگلستان میں علامہ محمد اقبال سے ملاقات بھی کی تھی۔اس سے بہت پہلے ایک گمنام طالب علم کی حیثیت سے چودھری رحمت علی نے 1915ء میں اسلامیہ کالج لاہور کی بزم شبلی کی افتتاحی تقریر کے موقع پر بھی آزاد مسلم ریاست کے قیام کا تذکرہ کیا تھا۔ 1933ء میں انہوں نے پاکستان کے نظریے کو وضاحت سے بیان کیا اور لفظ پاکستان بھی وضع کیا۔

1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ آیا۔جس میں صوبوں کی محدود خود مختاری اور مرکزی وفاق کا اہتمام تھا۔ جو یکم اپریل 1937ء سے جزوی طور پر نافذ بھی ہوا۔ اس کے تحت صوبائی حکومتوں کے انتخابات ہوئے۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے الیکشن لڑے۔ جناح 1937ء میں ایک بار پھر اور آخری بار مصالحت کے لیے تیار ہوئے۔لیکن ہندوؤں نے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا کانگریس نے سات صوبوں میں وزارت بنائی اور جولائی 1937ء سے اکتوبر 1939ء تک حکومت کی۔اس عرصے میں اقلیتوں پر وہ ظلم ڈھائے گئے کہ دنیا چیخ اٹھی۔ ہندو کانگریس کے عملی رویے سے ہندوستان بھر کے مسلمان اور ان کے لیڈر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوں کے ساتھ کسی قسم کی سیاسی مفاہمت ممکن نہیں۔ چناں چہ مسلمانوں نے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے واضح راہ عمل کی تلاش شروع کر دی۔ 1938ء میں حیدر آباد کے سید لطیف نے چار منطقوں پر مشتمل وفاق کی تجویز پیش کی گئی۔ڈاکٹر

لطیف کی کتاب کے دیباچے میں سر عبداللہ ہارون نے دو وفاقوں کی تجویز پیش کی۔
1939ء میں پنجابی کے نام سے پانچ ملکوں کی کنفیڈریسی کی تجویز پیش کی گئی۔ متحدہ ہندوستان کے تحت جولائی 1939ء میں سر سکندر حیات نے اپنی تجویز پیش کی۔ یہ سات حصوں کے وفاق کی سکیم تھی۔

1939ء میں علی گڑھ کے دو پروفیسروں نے تین آزاد ریاستوں کی تجویز پیش کی۔ پاکستان، بنگال اور ہندوستان، جو معاہدوں سے آپس میں اور برطانیہ سے منسلک ہوں۔ ہندوستان کی سیاسی فضا میں کسی نہ کسی شکل میں علیحدگی کے یہ خیالات اڑ رہے تھے کہ اکتوبر 1938ء میں کراچی صوبائی مسلم لیگ نے اپنے جلسے میں ایک قرارداد پاکستان کی بنیاد ڈالی۔ اس قرارداد میں مکمل آزاد حق خود ارادی کا عزم کیا گیا تھا اور پہلی بار قوم کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ ستمبر 1939ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے آئینی تجویزوں کی چھان بین کے لیے کمیٹی مقرر کر دی 22 مارچ 1940ء تک قرارداد کے مسودے پر غور ہوتا رہا۔ 23 مارچ کو یہ قرارداد اقبال پارک کے ایک جلسے میں بنگال کے وزیر اعظم اے کے فضل الحق نے پیش کی۔

چودھری خلیق الزمان کی تائید کے بعد دوسرے صوبوں کے مندوبین نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر بہترین تقریر قائداعظم کی تھی جس میں قراردادِ پاکستان کے پس منظر اور دو قومی نظریہ پر بڑی مدلل بحث تھی۔ اس قرارداد کو قراردادِ لاہور کا نام دیا گیا۔ اس میں ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں دو آزاد مملکتوں کے قیام

کی تجویز بھی کی گئی تھی۔ پھر اپریل 1941ء میں مدراس میں اس قرارداد کو مسلم لیگ کا یا مقصد نصب العین قرار دیا گیا تھا۔ ابھی تک اس میں ریاستوں کا لفظ موجود تھا پھر اپریل 1946ء میں ہندوستان بھر کے لیگی ممبروں کا کنونشن ہوا جس میں حسین شہید سہروردی کی قرارداد پر ریاستوں کے بجائے ریاست کا لفظ کر دیا گیا اور یہ ایک متحدہ پاکستان کا عہدنامہ بن گیا۔

اس قرارداد پاکستان کے مطابق 3 جون 1947ء کو تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان ایک آزاد خود مختار اسلامی مملکت کی حیثیت سے 14 اگست 1947ء کو وجود میں آ گیا قائم ودائم رہنے کے لیے۔ ان شاء اللہ!!۔

شرح شکوہ جوابِ شکوہ

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی دو مشہور طویل نظمیں، آسان ترجمہ و تشریح کے ساتھ

تالیف

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ

فرہنگ و شرح

حافظ حامد محمود

Rs. 380/-

بُک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

شاد باد منزلِ مُراد

حصہ دوم

(تعلیمی مقابلوں کے لیے مذاکرے، مباحثے اور تقریروں کا حسین مجموعہ)

قیمت: -/480 روپے

دو حسین انتخاب

دو حسین کتابیں

PRIZE WINNING
DEBATES & SPEECHES

اِنعام یافتہ تقریریں

مُصنّف: پروفیسر سعید راشد علیگ

نظرِ ثانی: کیپٹن ریاض احمد انجم

نفیس طباعت، اعلیٰ کاغذ، خوبصورت سرورق اور مضبوط بائنڈنگ

ناشران

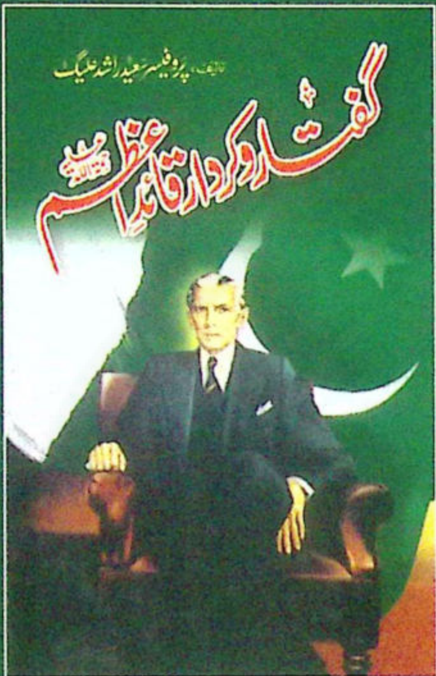
بُک کارنر

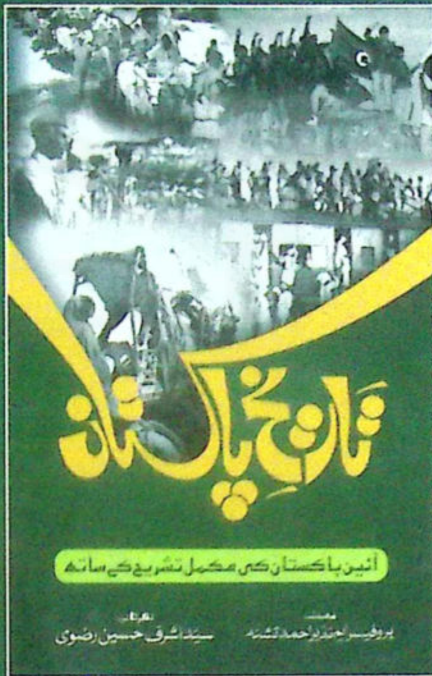
شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

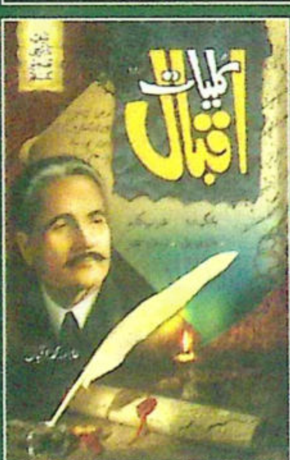
دفتر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

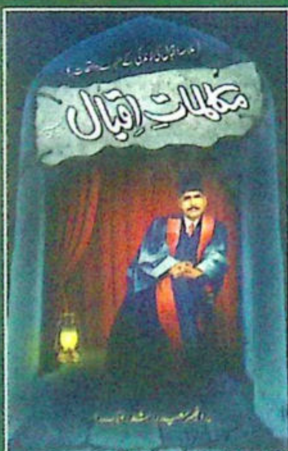
پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بُک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

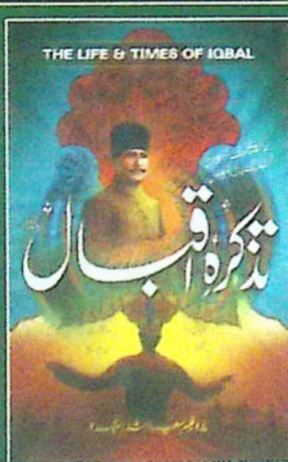
خوبصورت اور معیاری کتابیں











ناشران بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 621953 ، 0544-614977 موبائل 0323-5777931 ، 0321-5440882

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
bookcornershowroom@gmail.com

ISBN: 978-969-9396-62-5

Rs. 480.00